فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوارِ ربانی	سفارش کا قرآنی نسخہ	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	7
قولِ نبیؐ	سیکھنے سکھانے کے رہنما اصول	ڈاکٹر کوثر فردوس	10
خاص مضمون	عورت افکارِ اقبال کے آئینے میں	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	13
سارا جہاں ہمارا	من الظلمت الی النور	ابوا احمد / محمود غزنوی	17
نوائے شوق	ذکرِ محمد ﷺ	غلام مرتضیٰ اصغر	23
	نعتِ رسول ﷺ	نسیم آرا	23
	زندگی ٹھہر ذرا	نجمہ یاسمین یوسف	24
	تو کیا!	شمیم فاطمہ	25
	غزل	صہیب اکرام	25
	غزل	شہود ہاشمی	26
	غزل	نجمہ شاہین کھوسہ	26
حقیقت و افسانہ	قیمت	نصرت یوسف	27
	سوتیلے پن کی چھاؤں (1)	عالیہ حمید	32
	اللہ کی میزبانی	سعدیہ شفیق	39
سلسلہ وار	داستانِ عطاؤ بخشش	ڈاکٹر ثمین ذکا	40
ہلکا پھلکا	چلتے چلتے	فرزانہ چیمہ	46
	کبھی ہم خوبصورت تھے	رمانہ عمر	49
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	52
سیر و سیاحت	شہرا چھے کہ بن	نور اعجاز	58
رپور تاژ	شب جائے کہ من بودم	سعدیہ اکرام	65
زندگی کا فن	آپ کی ساس آپ کی محسن	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	67
گھر داری	کچن کارنر	عزہ عثمان۔شازیہ مشتاق	69
محشر خیال	فرزانہ چیمہ، شمیم فاطمہ، ہما جبین، عشرت لطافت، غوثیہ ارسلان، ام عثمان، سعدیہ شفیق، رفعت اشتیاق		71
حسن و صحت	بال سفید ہونا اور جھڑنا	شگفتہ فاطمہ	76
بتول میگزین	خالدہ حبیب، سعیدہ عمران، آمنہ سطوت کلیم		78

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! پرانی بات ہے، کرکٹر ظہیر عباس کا یہ جملہ ایک بار بہت سراہا گیا تھا کہ ہم کھیل میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور سنجیدہ باتوں کو کھیل سمجھ لیتے ہیں اور اب تو یہ جملہ اور بھی زیادہ حقیقت بنتا ہوا نظر آیا۔ کیونکہ اپنی ساری خرابیوں کے باوجود ہم بحیثیت قوم انڈیا کو ہی اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں۔ انڈیا کے مقابل ہمارا جذبہ حب الوطنی جس شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے، اس کا موازنہ کسی اور صورتحال سے نہیں ہے۔ یہ ہماری مجموعی سائیکی کا حصہ ہے، ہمارے وجود کا جواز ہے اور اس کو دبانے، بدلنے، دھندلانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ یہ حب الوطنی کا جذبہ جب ملکی پالیسی میں ڈھل نہیں پاتا تو اپنے نکاس کے اور راستے ڈھونڈتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہم نے حالیہ کرکٹ میچ کے دوران دیکھ لیا ہے۔ ہار جیت سے قطع نظر، خوشیوں کو ترسی ہوئی، اصل دشمن کے دانت کھٹے کرنے کا موقع ڈھونڈتی ہوئی قوم نے اپنے ان تمام جذبوں کو جواب فرسٹریشن میں ڈھلتے جا رہے تھے، نکالنے کا ایک موقع پایا اور اپنے جذبات کو پیرایۂ اظہار دے دیا۔

مگر سب سے زیادہ دل شکن بات یہ ہے کہ اخبارات میں اور انٹرنیٹ پر پاکستان حکومت کی سطح پر اس میچ کی فکسنگ کے بارے میں خبریں آ رہی ہیں اور لاہور ہائی کورٹ میں دو وفاقی وزراء کے نام شامل کر کے مقدمہ بھی درج کروا دیا گیا ہے۔ اگر ان الزامات میں حقیقت ثابت ہو جاتی ہے تو قوم کے جذبات سے کھیلنے کی اس سے بدترین مثال ملنا شاید روئے زمین پر مشکل ہے۔
قوم کے جذبے تو ہمیشہ سے زیادہ حساس تھے ہی، مگر میڈیا پر جس طرح اس میچ کا اتنا مبالغہ آمیز جنون پیدا کیا گیا اور وزیر اعظم بنفس نفیس موہالی پہنچ گئے، یہ اس سانحے سے عوام کی توجہ ہٹانے کی کوشش محسوس ہوئی جس نے ہر دل کو غم و غصے سے بھر دیا ہے۔ کیا وہ غم کسی طرح ہلکا ہو سکتا ہے جو اس آزاد ملک پر مسلط غلام ٹولے نے دشمنوں کے غنڈے کو باعزت بری کر کے اپنے عوام کو پہنچایا؟ یہ قومی مفادات کے ساتھ بدترین غداری کے مجرم حکمران جنہوں نے قوم کے زندہ سپوت بیچ ڈالے، اب مقتولین کو بیچنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس کے اس مجرمانہ کارروائی میں ملوث کوئی کردار علاج کے بہانے تو کوئی غیر ملکی دورے کے بہانے ملک سے غائب ہو گیا تا کہ عوامی غضب کا نشانہ نہ بن جائے۔ مقتولین کے ورثا جن کے متنازعہ دستخطوں والے کاغذات میڈیا کے سامنے پیش کئے گئے، انہیں بھی غائب کروا دیا گیا۔ معاملہ قانون کے مطابق اور مبنی بر انصاف تھا تو ان اقدامات کی کیا ضرورت تھی؟ اپنے لوگوں کا بھاؤ تاؤ کرنے والے، مل جل کر بھائی چارے سے کھانے پینے والے اس ٹولے کو یہی یاد دہانی کروائی جا سکتی ہے کہ

حضور آپ کو بھی ایک روز مرنا ہے
حضور آپ کو بھی قبر میں اترنا ہے
وہاں جہاں پہ یہ جاہ وحشم نہیں ہوں گے
وہاں جہاں پہ یہ تیغ وعلم نہیں ہوں گے

فلوریڈا کے ایک چرچ میں ٹیری جونز نامی ملعون پادری نے جو یقیناً خود مذہبِ عیسائیت کے نام پر ایک دھبہ ہے، ان قرآنی آیات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردی، جن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ یہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے ......تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو......تمہارے خلاف ان کے غیض و غضب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں (اٰلِ عمران) یہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں''(الصّف)

اللہ یقیناً اپنے سچے کلام کی خود حفاظت فرمانے والا ہے کہ یہ اُس کا وعدہ ہے اور جس کے لئے وہ کسی کی کوشش کا محتاج نہیں ہے۔مگر یہ گلوب پر پھیلی ہوئی دنیا کی دوسری بڑی مذہبی قوت کے لئے انتہائی ذلت کا مقام ہے۔ان کی کثرت کے باوجود ان کے وسائل پر پلنے والے اہلِ مغرب کی یہ جرأت ہے کہ وہ ان کی کتاب کے ساتھ یہ سلوک روا رکھیں اور پھر اس انسانیت سوز عمل کی مدافعت کریں۔مسلم ممالک میں بے بنیاد باتوں پر حقوقِ انسانی اور مذہبی رواداری کی خلاف ورزیوں کا شوروغوغا اٹھانے والے کس قدر ڈھٹائی سے اپنے لئے تمام حدیں پار کر جانا اور ہر گری ہوئی حرکت کرنا جائز سمجھتے ہیں، کیا ہمارے جرمِ ضعیفی کے سوا بھی اس کی کوئی تعبیر کی جاسکتی ہے؟ تمام مسلم ممالک یک آواز ہو کر ایک وارننگ بھی جاری کردیں تو اس شر پسندی کا مقابلہ کرنے کو کافی ہے۔
مگر بقول احمد فرؔید:

جو سوئے سدرہ چلا تھا برائے حبل اللہ
وہ قافلہ کہاں فرقوں میں بٹ کے آگیا ہے
فرؔید جنس نہ تھے ہم تو ایک امت تھے
ہمارا بھاؤ کہاں آج گھٹ کے آگیا ہے

لیبیا بدترین خانہ جنگی کا شکار ہے، اندرونی انتشار کا فائدہ اٹھا کرامت کے وسائل پر پنجے اور دانت گاڑنے والے اپنی فوجیں چڑھا لائے ہیں اور ملک کی خودمختاری داؤ پر لگ گئی ہے۔اللہ تعالیٰ امت کے حال پر رحم فرمائے۔

گیلپ پاکستان کے ایک تازہ سروے کے مطابق پاکستانیوں کی غالب اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ گزشتہ سالوں کے دوران ٹی وی پر عریانی بڑھ گئی ہے اور نامناسب مناظر کی وجہ سے اپنے گھرانے کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

ہمارے ہاں مقامی اور غیر ملکی ٹی وی چینلز پر بلا روک ٹوک ہر قسم کا مواد دکھایا جا رہا ہے جس میں سر فہرست بھارتی عریاں اور اخلاق باختہ پروگرام ہیں جو کسی طور پر بھی پاکستانی تہذیب و معاشرت سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اگر ہمیں یہی سب کچھ دیکھنا اور برداشت کرنا تھا تو بھارت سے علیحدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی حال انگریزی چینلز کا ہے جن پر انتہائی قابل اعتراض اشتہارات دکھائے جاتے ہیں اپنی نسلوں کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ میڈیا کی اخلاق باختگی کے خلاف باشعور طبقہ یک آواز ہو جائے اور حکومت کو مجبور کر دے کہ وہ میڈیا پالیسی کو قومی مقاصد اور دین و ملت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کرے۔

دعا گو

صائمہ اسما

قارئین بتول کے لئے خوشخبری

اب ہر ماہ کا تازہ شمارہ آن لائن ہماری ویب سائٹ پر ملاحظہ کیجئے

www.batool.com.pk

خاص خواتین کے لئے

سفارش کے حصول کا قرآنی نسخہ

آیئے شفاعت کی یقینی گارنٹی کا طریقہ قرآن سے اخذ کریں۔خاص خواتین کے لئے جوطریقہ بتایا گیا،سورہ الممتحنہ میں ہے۔

''اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کے لئے آئیں اوراس بات کا عہد کریں کہ وہ

۱۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشریک نہ ٹھہرائیں گی

۲۔چوری نہ کریں گی

۳۔زنا نہ کریں گی

۴۔اولاد کوقتل نہ کریں گی

۵۔اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کرنہ لائیں گی

۶۔کسی امرمعروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی

تو ان سے بیعت لے لو، اوران کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرو۔بے شک اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا اوررحم فرمانے والا ہے۔''

پہلے''بیعت'' کی وضاحت ضروری ہے۔

بیعت کا لفظ''بیع'' سے نکلا ہے ۔کوئی ایسی خرید و فروخت جس میں ایک ہاتھ لواور ایک ہاتھ دو۔نقد سودا ہے جیسا دو گے ویسا لو گے۔اپنا آپ حوالے کر دینا، معاہدہ کرنا، وعدہ کرنا۔وعدہ وفا کرنے پر مغفرت کی دعا اللہ کے حضور سفارش، خود حضور ﷺ کے ذمہ ہوگئی کہ وہ ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ ''بے شک غفور'' (سفارش قبول کر کے معاف کرنے والا) بھی ہے اور''رحیم'' بھی ہے یعنی رحمت اُس کا شیوہ ہے، سفارش کے بعد مزید کرم بھی فرمائے گا ...... اے خواتینِ اسلام ! اٹھو اپنے مقدر سنوارنے کی فکر کرو۔اس بیعت کے لئے تیار ہو جاؤ۔

۱۔شرک:

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ساتھ کسی کوشریک کرنا شرک ہے یہ سب جانتے ہیں۔''شرک''ظلمِ عظیم ہے (سورہ لقمان) اور یہ کبھی معاف نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ کی ذات کوکلی طور پر یکتا، تنہا مالکِ کائنات ماننا ہمارا ایمان ہے۔اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقت تصوراور احساس غالب رکھنے کی شعوری کوشش کرنا، اُس کو راضی رکھنے کی سبیل تلاش کرنا''موحد'' ہونا ہے۔

ایک سادہ سی بات ہے ہر وہ مصروفیت، شغل، سوچ، جملے ، محفل جو اللہ رب العزت کی یاد سے غافل کر دے، اُس کی نا فرمانی میں گزرے، شرک جیسی ہے کہ ہر نعمت، وقت کا ہر لمحہ اُس کا عطا کردہ ہے۔جس کی عطا کردہ چیز ہے اسی کے لئے نہ ہوئی ، کسی اور کی شراکت کی گئی تو شرک ہی ہوا! ذرا ایک دن کے اوقات ، سوچوں، باتوں ، جملوں ، مصروفیات، شغل کا جائزہ لیں ، کتنے شیطانی اور کتنے رحمانی احساسات غالب رہے

؟ کتنے لمحے ''موحّد'' گزرے اور کتنے شیطانی شراکت کے ساتھ؟ اور پھر اس نامۂ اعمال کا سامنا کرنے کی جرأت و ہمت کا احساس تازہ کریں ۔ اُس دن جب ہر لمحہ انسان کو دکھایا جائے گا اور انسان کہے گا'' یہ کیسی کتاب ہے جس میں ہر چیز پوری جزئیات کے ساتھ درج ہے (کہف) اور مہلتِ عمل کا ایک سیکنڈ بھی موجود نہ ہوگا۔ جان کنی جیسی آفت ہر طرف پھیلی ہوگی۔ آج جس جرأت اور بے خوفی سے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے، وہاں ندامت و پشیمانی سے بہہ جانے والا پسینہ انسان کو غرقاب کر رہا ہوگا۔

۲۔ چوری نہ کریں گی

اس میں ہر طرح کی چوری شامل ہے۔ کسی جگہ سے بھی کہیں سے بھی مال اڑانا۔ مگر شوہر کے مال میں سے فی الواقع جائز ضرورت کے لئے کافی ہوجانے والا مال یا رقم مستثنیٰ ہے (احکام القران ابن عربی) پھر احادیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو غصب کرنا بھی ایک طرح سے چوری میں شامل ہے۔ جیسے نماز کے ارکان و تنذ کار درست انداز میں ادا نہ کرنا۔ شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے پر خرچ کرنا بھی چوری کی ایک قسم ہے (مسند احمد)

۳۔ زنا نہ کریں گی

اپنی عصمت، آبرو کی حفاظت کے لئے ہر اس عمل سے دور رہیں گی جس سے عزت آبرو پہ دھبہ لگنے کا اندیشہ ہو۔ حدیث میں جسم کے ہر حصے کے زنا کا ذکر کیا گیا ہے۔ آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں، زبان نیز خوشبو لگا کر گھر سے باہر جانا، بے پردہ لباس پہننا، غیر محرم مردوں سے بلا وجہ بات چیت کرنا (سورہ نور و احزاب میں اس کی تفصیلات درج ہیں) یہ سب برائی کی طرف لے جانے والے راستے ہیں۔ پیارے نبی ﷺ کی شفاعت حاصل کرنے کے لئے کیا آج کی مسلمان عورت کے رنگ ڈھنگ قابل قبول ہیں؟ یہ انداز و اطوار یہ لباس اور ناشائستہ تہذیب، کیا حضور اکرمؐ اپنی امت کی بیٹیوں کے لئے پسند فرما گئے تھے اور امت کی بیٹیاں ایسے لباس و کردار کے ساتھ حضورؐ کا سامنا کریں گی؟

۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی

قتل اولاد کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم اس میں شامل ہے اسقاطِ حمل، ضبط ولادت (چند امور اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن ان کی تہہ میں کیا جذبہ کارفرما ہے اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے) رزق کی تنگی کا خوف دراصل اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے کی نفی ہے۔

معیار زندگی کے نیچے گرنے کا خوف بھی دراصل نفس کی خواہشات کو بے لگام اور لامتناہی کرنے کا نتیجہ ہے......سورہ انعام میں فرمایا!

''یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں'' اولاد کی بحیثیتِ مسلمان تربیت نہ کرنا ان کا نظریاتی قتل ہے کہ وہ امت مسلمہ کے کارآمد فرد کی حیثیت سے پروان نہ چڑھائے گئے۔

۵۔ بہتان باندھنے سے باز رہنا

یہ بہتان چھوٹا ہو یا بڑا اس سے بچنا ''زبان کی حفاظت''

کا وعدہ ہے دوسرا پہلو جو تفہیم القرآن میں درج ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضورؐ کو فرماتے سنا ''جو عورت کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ شامل کردے جو اس خاندان کا نہیں ہے ناجائز بچہ ہے، اس عورت کا اللہ تعالیٰ سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اللہ اُسے کبھی جنت میں داخل نہ کرے گا''(یعنی شفاعت کی امید نہ رکھے)

۶۔ کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی

یہ ایک ایسا قانونی نکتہ ہے جس پر حکومتوں، اداروں اور تحریکوں کی درست سمت کا تعین ہوتا ہے۔ یہ دستوری دفعہ ہے اسلامی قانون کی، کتنی اہم بات ہے کہ حضور اکرمؐ کی اطاعت پر بھی طاعت فی المعروف کی شرط رکھی گئی ہے۔ حالانکہ یہ ایمان کا حصہ ہے کہ اللہ کا رسولؐ اپنی طرف سے کوئی حکم نہ لگائے گا'' وہ جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے''(النجم) اور نہ ہی کوئی مومن یہ شک کرسکتا ہے کہ آپؐ منکر کا حکم دے سکتے ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑھ کر نہیں اور اللہ کے قانون کی مقررہ حد سے تجاوز ممکن نہیں۔

یہ دستوری دفعہ واضح کرتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت کی جائے اور معروف میں ہی کی جائے۔ معروف نہ ہو تو کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہو جاتا ہے۔ اولی الامر کو اللہ تعالیٰ نے پابند کر دیا کہ وہ صرف معروف میں اطاعت کروا سکتے ہیں۔ جو معروف کے علاوہ بھی اولی الامر کی اطاعت کرتا ہے اُس کے بارے میں احکام القرآن میں درج ہے کہ

جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے اللہ تعالیٰ اُسی مخلوق (فرد، حکومت) کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔

حکومت، ادارے کا سربراہ، شوہر، تحریکی ذمہ داران کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے۔ وہ شوہر، ذمہ دارانِ تحریک اور حکومتیں جو اپنے ماتحتوں سے اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں معروف سے ہٹ کر اطاعت کرواتے ہیں گنہگار ہیں اور اطاعت کرنے والی مخلوق بھی گنہگار ہے۔ کوئی ماتحت اس عذر کی بنا پر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے افسر یا حاکم بالا یا شوہر نے اس کو اس گناہ کا حکم دیا تھا۔ بیویوں اور ماتحت کارکنان کو اپنی آنکھیں، کان، دل و دماغ اور ایمان کو ہوش میں رکھنا ہوگا تاکہ وہ بے خبری میں نہ مارے جائیں۔ بیعت کے لئے آنے والی خواتین سے ''معروف میں اطاعت'' کا وعدہ لے کر پابند کر دیا گیا کہ وہ وما آتاکم الرسول فخذوہ ومانہاکم عنہ (سورۃ الحشر ۷) کے مطابق صرف رسولؐ کے دیے ہوئے معروف و منکر میں کسی کی اطاعت کی پابند ہیں، اس خاتون کے لئے نبی مغرف کی دعا کریں گے اور خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا

'' کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا عمل ملا جلا ہے، کچھ نیک کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبیؐ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو، نیکی کی راہ میں بڑھاوا دو، ان کے حق میں دعائے رحمت و مغفرت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی، اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں
کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے
اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم
ہے“ (توبہ ۱۰۲ تا ۱۰۴)

اور فرمایا ”اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ“ (سورۃ ہود ۱۱۴)

بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

تو آیئے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے صدقہ و خیرات کریں۔ نیکیاں سمیٹنے کا عزم اور منصوبہ بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو اور ہمارا نامۂ اعمال ایسا تو ہو جائے کہ شفاعت کی امیدِ روشن تسکین دیتی رہے۔

سیکھنے سکھانے کے رہنما اصول

قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے سنا وہ کہتے ہیں، کہ رسولﷺ نے فرمایا:

دو (آدمیوں کی) خصلتوں پر کوئی رشک کرے تو جائز ہے ایک تو اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ، وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے ۔ دوسرے اس پر جس کو اللہ نے قرآن اور حدیث کا علم دیا وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

(کتاب العلم از صحیح بخاری)

اس حدیث کی روشنی میں علم سیکھنے اور سکھانے کے چند بنیادی اصول درج کیے جا رہے ہیں جن سے حصولِ علم کا راستہ آسان ہوتا ہے اور انسان صحیح علم تک پہنچتا ہے۔

۱۔ علم حاصل کرنا مقدم ہے ۔ علم پر عمل پیرا ہونا اور دوسروں کو اس کی طرف بلانا یا وعظ کرنا یا ابلاغ کرنا دونوں سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود علم حاصل کیا جائے ۔ قرآن کہتا ہے، جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے ۔

حصول علم کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان کتب کا مطالعہ کرے، انٹرنیٹ سے پڑھ لے، آڈیو یا ویڈیو کیسٹ سن لے لیکن اس سے بھی احسن یہ ہے کہ استاد سے سیکھے۔

۲۔ علم حاصل کرنے کے لئے ، ریاضت اور محنت کی جائے ، مشقت اٹھائی جائے سفر کیا جائے اس کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے ۔ احادیث کے مطابق حصول علم کے لئے نکلنے والے کے لئے اللہ بہشت کا راستہ آسان کر دے گا۔ حصول علم کے لئے نکلنے والوں کے لئے فرشتے پر بچھا دیتے ہیں، یعنی اُن کا اعزاز و اکرام کرتے ہیں ۔ حصول علم کے لئے کوشش کرنے والوں کے لئے ، پتھروں کے اندر رہنے والے کیڑے ، سمندروں کی مچھلیاں تک دُعا کرتی ہیں۔

۳۔ علم عمر کے ہر حصے میں سیکھا جائے ۔ بزرگ ہونے سے پہلے اور بزرگ ہو کر بھی علم سیکھتے رہیں ۔ عمر کی قید نہ لگائی جائے کہ اب تو ہم بوڑھے ہو چکے بلکہ مہد سے لحد تک حصول علم کی کوشش کی جاتی ہے۔

۴۔ علم حاصل کرنے کے لئے اوقات اور دن مقرر کر لیا جائے کہ ایک دن یا کچھ وقت، اپنے معاش وغیرہ کی ذمہ داری کے لئے دوڑ دھوپ نہیں ہو گی بلکہ علم سیکھا جائے گا۔ علما کی محفل میں اور استاد کے پاس وقت گذارا جائے گا۔

۵۔ علم حاصل کرنے کے لئے ، دوستوں کی معاونت حاصل کی جائے ، ایسے دوست بنائے جائیں جو علم وہ خود سیکھیں وہ ہمیں سکھانے والے ہوں ۔ جن علم کی محفلوں ، یا مجلسوں میں خود پہنچنا، سفر، ملازمت، کاروبار، گھریلو مصروفیات کی بنا پر ممکن نہ ہو، دوست کے ساتھ، تقسیم کار کر کے طے

کیا جائے کہ وہ وہاں جائے اور پھر آ کر اُس علم سے آگاہ کرے۔ ایسے ہی اپنا معاملہ بھی رکھا جائے۔

۶۔علم حاصل کرنے کے لئے، اپنا وقت اور اپنا سرمایہ صرف کیا جائے۔کمانے کے اوقات کو بھی محدود کیا جائے۔خود کو معاش اور دیگر معاشرتی ذمہ داریوں میں اتنا نہ تھکا لیا جائے کہ علم حاصل کرنے کے لئے وقت اور ہمت باقی نہ رہے۔

۷۔علم حاصل کرنے کے لئے جن مجالس میں جائے تو وہاں مجلس کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھے۔جلدی اور وقت مقررہ سے کچھ پہلے پہنچے اور مقرر کے قریب، بہتر جگہ حاصل کرے۔ اگر تاخیر سے پہنچے یا اُس سے پہلے دیگر لوگ پہنچ چکے ہوں تو لوگوں کو تکلیف دیئے بغیر آگے کی خالی نشستوں پر جا کر بیٹھ جائے۔خود راستے میں نہ بیٹھے، نشستیں چھوڑ کر نہ بیٹھے۔مقرر، استاد، تقریر و تعلیم کا آغاز کر چکا ہو تو جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے ۔ پھلانگ کر آگے نہ جائے کہ شرکاء کے لئے تکلیف اور استاد انہماک میں حائل ہو۔

۸۔استاد سے، یا کسی ماہر علم سے کوئی بات پوچھنی ہو تو اُس کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کرے، بات کے بیچ میں سوال نہ کرے۔

۹۔علم صحیح وہی ہوگا جس کی سند معتبر ہو۔مستند علم حاصل کیا جائے اور پھیلایا جائے ۔استاد سے سنا جائے، استاد کو سنا دیا جائے، استاد کا لکھا حاصل کیا جائے۔

۱۰۔علم کی بات اونچی آواز سے کی جائے کہ شاگرد تک پہنچے وہ سن سکے اور عمل کر سکے۔

۱۱۔علم کی بات معلوم ہو اور دیگر افراد کسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہوں تو اُن کو اس سہو، کوتاہی پر تنبیہہ کرنا چاہیے۔

۱۲۔علم کی بات بتائی جارہی ہو اور کوئی سوال کرے تو جو بات کی جارہی ہے اس کو مکمل کر کے جواب دے دیا جائے یا سوال بہت اہمیت کا حامل ہے تو اپنی جاری بات کو روک کر جواب دے دیا جائے اور باقی بات بعد میں مکمل کر لی جائے۔

۱۳۔علم کی بات بتاتے ہوئے معلومات کا ذریعہ اور سند بتائے کہ میں نے یہ بات کس سے سنی ہے۔کس کتاب میں پڑھی ہے یا کس ذریعے سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔

۱۴۔علم کی بات تحریر کر کے کسی کو بھجوائے تو اپنے دستخط کرے نام لکھے مہر لگائے۔یعنی گمنام تحریر نہ بھجوائے کہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔دیگر پیغامات و معاملات کرتے ہوئے بھی یہ ادب ملحوظ خاطر رکھے۔

۱۵۔علم آزمانے کے لئے استاد اپنے شاگردوں سے سوال کرے، والدین اپنی اولاد کو ادب سکھانے کے لئے، بڑے چھوٹوں کو اخلاقیات و آداب معاشرت وغیرہ سکھانے کے لئے بیان کا ہی نہیں، سوال کا طریقہ بھی استعمال کریں۔

باہم گفتگو اور سوال جواب کے یہ طریقے جو نبی ﷺ نے بتائے، آج مغربی دنیا Teaching methodologies کے نام پر انہی طریقوں سے بڑے مہنگے کورسز کی شکل میں کرواتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لیکچر interactive ہونا چاہئے ۔ یعنی شاگرد کو بھی ساتھ شامل کیا جائے، رائے مانگی جائے، سوال کیا جائے۔

۲۰۔علم سکھانے کے لئے تمثیلات کا استعمال بھی کیا

جائے جیسے مومن کی مثال کھجور کے درخت کی ہے جس میں سراسر بھلائی اور سدا بھلائی ہوتی ہے۔

۲۱۔ علم سکھانے کے لئے شاگردوں میں سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کا چناؤ کیا جانا چاہیے۔ اُن کے ساتھ اضافی محنت کر کے، اُن کو علم پھیلانے کے لئے تیار کرنا چاہیے۔ اُن کے دروس کو سننا یا ان کی کتب کو پڑھ کر سند دینی چاہیے۔ پھر اُن کو اس علم کو دوسروں اور دوسرے شہروں تک پہنچانے کی نصیحت اور تلقین کرنی چاہئے کہ علم پھیلتا رہے۔

۲۲۔ رب سے علم میں اضافے کی دعا کرتے رہنا چاہیے کہ یہ شاگرد اور استاد دونوں کے لئے لازم ہے۔

۲۳۔ شاگرد حصول علم کے لئے علم والے شخص کے بارے میں استفسار کرے کہ وہ کون شخص ہے۔ پھر اس شخص تک رسائی حاصل کرے اور اس کے لئے بھی دوسرے لوگوں سے پوچھ لے اور اپنے استاد کی پہچان کر کے اس سے علم حاصل کرے۔

۲۴۔ علم جتنا بھی ہو، خواہ صرف بنیادی علم کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی ہو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہیے صرف ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ یا کچھ آداب و معاملات کا علم بھی ملے تو وہ دوسروں کو بھی بتانا چاہیے۔

۲۵۔ استاد کو مجلس میں بیٹھ کر علم سکھانا اولیٰ ہے ۔ چلتے چلتے یا سواری پر یا ایسے دیگر مواقع پر کچھ نصیحت و تنبیہہ تو ہو سکتی ہے ، با قاعدہ وعظ یا درس کے لئے محفل کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عورت افکارِ اقبالؒ کے آئینے میں

علامہ محمد اقبالؒ ایک الہامی شاعر تھے، ان کی شاعری اورنثر قرآن وحدیث کی تشریح ہے اوراس میں صحیح العقیدہ مسلمان کی فکروآگہی کا نور جھلکتا ہے۔

علامہ اقبال حقیقت میں پوری امت کے حدی خواں اور قائد ہیں۔امت مسلمہ کا ہر فرد مرد ہو یا عورت حتیٰ کہ بچوں کی فکری راہنمائی بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔

اقبالؒ نے مسلمان عورت کا جونقشہ اپنے کلام میں پیش کیا ہے اس سے عورت کی حرمت نمایاں ہے۔علامہ اقبالؒ نے جنوری 1929ء میں انجمن خواتین مدراس کی ایک تقریب میں خواتین کے بہت سے سوالوں کے جواب میں ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا:

''مجھے یہ اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام میں مرد وزن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیات سے یہی اخذ کیا ہے کہ مقام ومرتبے کے لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں۔بعض علما مرد کی فوقیت کے قائل ہیں اور وہ اس کی دلیل میں آیت الرجال قوامون علی النساء پیش کرتے ہیں۔عربی محاورے کی رو سے اس کی یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔عربی گرامر کی رُو سے قائم پر جب ''علیٰ'' آئے تو معنی محافظت کے ہوجاتے ہیں۔مرد عورت کا محافظ ہے ھن لباس لکم وانتم لباس لھن لباس بھی محافظت کے لئے ہوتے ہیں۔قرون اولیٰ کی صحابیات جہاد میں شریک ہوئیں مرد کی محافظت میں رہتے ہوئے حضرت عائشہ نے مردوں کو تعلیم دی ان کی تربیت کی مگر پردہ میں رہ کر۔عباسی خلافت میں خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھیں، خودفتویٰ صادر کرتی تھیں مگر مردان کی محافظت سے بے پروا نہ ہوئے تھے۔عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ اصول قائم نہیں ہوتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ، اگر آپ ان حقوق پر غور کریں جو اللہ تعالیٰ نے عورت کو عطا فرمائے ہیں تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ اس دین نے عورت کو کسی بھی درجہ میں مرد سے کم تر نہیں رکھا۔''

اسی تقریب میں علامہ اقبالؒ نے مزید فرمایا۔

''آپ نے اپنے لئے ''اسیران قفس'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ان سے مجھے مغربی عورتوں کی تحریک کا خیال آرہا ہے جسے ترکی میں اور یورپ کے دیگر مقامات پر ایمنسی پیشن (Emancipation) مردوں کے غلبہ سے آزادی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔آپ کو لفظِ آزادی پر نہیں جانا چاہیے، آزادی کے درست مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔یورپ کی

آزادی کو ہم خوب دیکھ چکے ہیں، یورپین تہذیب باہر ہی سے دیکھی جارہی ہے۔کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ بڑھتے ہوئے معیار زندگی کا وہاں لوگوں پر یہ اثر پڑا ہے کہ بعض ماں باپ بچے کی زندگی کا بیمہ کرادیتے ہیں پھر اسے قطرہ قطرہ زہر پلا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کو ایسی ہلاکت سے بچانے کے لئے کئی سوسائٹیاں قائم ہیں ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قرآن پڑھیں اور اس کی تعلیم پر غور کریں'' (گفتارِ اقبال، مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۸۴،۷۵)

تعدد ازواج کا مسئلہ مسلمان عورت کو ہمیشہ اچنبھے میں ڈالتا ہے کیونکہ مسلمان مرد اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔علامہ اقبال نے اسی تقریب 1932ء میں عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''ان تمام امور میں شریعت اسلامی نے ایک عام اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ''الدین یُسر''۔(دین آسان ہے) پھر اسلام میں تعدد ازواج کا حکم نہیں دیا محض اجازت ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان مردوں نے اس اجازت سے بے جا فائدہ اٹھایا۔جس سوسائٹی میں اس قسم کی اجازت نہ ہو اس کو ضرورت کے وقت جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اس سے آپ ناآشنا نہیں۔ جرمنی میں ایک موقع پر یہ ضرورت پیش آگئی تھی ۔ آخر عہد نامہ ویسٹ فیلیا(West Phalia) میں بیس سال کے واسطے ہر مرد کے لئے تعدد ازواج جائز قرار دیا گیا۔ جب جنگ میں کسی قوم کے مردوں کی تعداد میں خاص کمی واقع ہوجائے تو آئندہ ملکی حفاظت کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ مرد ایک سے زائد بیویاں کرے۔قرآن پاک میں انہی مصالح کو سامنے رکھ کر اس قسم کی اجازت دی گئی ہے۔''

''جاوید نامہ'' کے نام سے علامہ اقبال کا دیوان 1932ء میں شائع ہوا، اس میں علامہ نے جن الہامی خیالات کا اظہار فرمایا ہے 1995ء میں عورتوں کی بیجنگ کانفرنس کے احوال میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوا ہے۔

مولانا رومیؒ کی رفاقت میں جب علامہ اقبال ''فلکِ مریخ'' سے گزرتے ہیں تو وہاں نبوت کی جھوٹی دعوے دار عورت کے خطاب کو سننے کا موقع ملتا ہے ، وہ اپنی پیرو کار عورتوں سے کہتی ہے۔

اے زناں، اے مادراں اے خواہراں
زیستن تا کے مثالِ دل براں

ماؤ، بہنو تم کب تک مرد کی غلامی اور دلبری کرتی رہوگی۔ مرد اپنی جھوٹی محبت کے ذریعے تمہارا استحصال کرتا ہے، زندگی کی دل آزاری، بچوں کی پیدائش کا جنجال ہے شوہر اور اولاد کے بغیر زندگی کتنی حسین ودلفریب ہے۔

از امومت زرد روئے مادراں
اے خنک آزادئ بے شوہراں

اور وہ مزید عورتوں کو بغاوت پر اکساتی ہے کہ

خیز و با فطرت بیا اندر ستیز
تاز پیکارِ تو حر گردد کنیز

یعنی ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ رحم مادر کے علاوہ کسی اور مصنوعی طریقہ سے آئندہ نسل کی پیدائش وافزائش ہو اور ہمارا استحصال بند ہو۔ ہمیں مرد کی چیرہ دستی اور ظلم و وحشت کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کے روحانی استاد مولانا رومیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

مذہبِ عصرِ تو آئینے نگر
حاصلِ تہذیبِ لا دینے نگر

مغربی تہذیب کا سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ وہ قوانین قدرت اور انسانی فطرت سلیمہ کی مخالفت سمت میں چل رہی ہے۔حیا اور عفت کا اس میں کوئی مقام و مرتبہ نہیں۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پر کار وسخن ساز ہے نمناک نہیں ہے
بے کاری و عریانی ومۓ خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

''جنت ماں کے قدموں تلے ہے'' علامہ اقبال اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ''رموزِ بےخودی'' میں ایک باب کا عنوان ہی ماں کے کردار پر ہے اور ماں کے احترام اور اس جذبہ مامتا کی حفاظت پر ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است
زانکہ اُو را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما
درخطِ سیمائے او تقدیر ما
گفت آں مقصود حرفِ کن فکاں
زیر پائے امہات آمد جناں
حافظِ رمز امومت مادراں
قوتِ قرآں و ملت مادراں

اقبالؒ کی نظر میں حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی زندگی مسلم عورتوں کے لئے مکمل اسوہ حسنہ ہے۔حضرت مریمؑ کی عظمت، حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ہونے کی حیثیت سے ہے مگر سیدہ فاطمہؓ کو تین مبارک نسبتیں عطا کی گئیں۔بیٹی ہونے کی حیثیت سے، بیوی ہونے کی حیثیت سے اور حسنینؓ کی والدہ ہونے کی حیثیت سے۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز

مزید فرمایا۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

عورت کی تعلیم کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا نظریہ یہی تھا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا شعور حاصل کرے اور اپنے میدان میں کمال حاصل کرے۔وہ خاتونِ خانہ ہو، چراغ خانہ ہو شمع محفل نہ ہو۔مغربی معاشرت کے بارے میں سوال کرتے ہیں:

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

ان کا واضح نقطۂ نظر یہ تھا جو آج بھی حقیقت ہے کہ:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر
موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

ضربِ کلیم میں علامہ اپنے افکارِ عالیہ میں فرماتے ہیں کہ

عورت اگر آزادانہ گھومے پھرے گی تو اس آزادی کا صلہ اسے ''زمرد کے گلوبند'' سے محرومی کی صورت میں ملے گا۔

''زمرد کا گلو بند'' یعنی وہ مقام و مرتبہ، عزت، احترام، تقدس، احساس ذمہ داری جو اسلام نے اس کے مقدر میں لکھا ہے اس سے وہ محروم ہو جائے گی۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے

فاش

مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خردمند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ

آزادئ نسواں کہ زمرد کا گلو بند

ضرورت اس امر کی ہے کہ کلام اقبال کو ''بیمار امت'' کی مسیحائی کے لئے استعمال کیا جائے۔ قرآن پاک، سنت و سیرتؐ کی اشعار میں تشریح روح کو اک نئی آبیاری عطا کرتی ہے۔ نغمگی، ترنم، الفاظ کی خوبصورتی انسانی فکر میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ جذبوں کو جگانے، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور جوش و جذبہ و غیرت دلانے کے کام آتی ہے۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام، اردو کلام کے ساتھ سیکھا جائے، سکھایا جائے۔ تعلیمی ادارے، قرآن فہمی کی کلاسز لینے والے استاد، پرائیویٹ تعلیمی ادارے، اکیڈمیاں ایک مہم کے طور پر اس زندہ کلام کے ذریعے ''زندگی'' پانے کی منصوبہ بندی کریں۔ بقول اقبالؒ

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر

بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایوا احمد
ترجمہ: محمود غزنوی

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

برطانیہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ سفید فام عورتوں میں اسلام قبول کرنے کا بڑھتا ہوا رجحان کیوں؟

سابق وزیر اعظم برطانیہ ٹونی بلیئر کی خواہر نسبتی نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان کا نام لورین بوتھ ہے اور وہ پیشہ کے لحاظ سے جرنلسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنے قبولِ اسلام کو ایران میں ایک مقدس تجربے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ برطانیہ کی ان جدید اعلیٰ پیشہ ور خواتین میں شامل ہو گئی ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے اور ایسی خواتین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مصنفہ ایوا احمد نے جس کی پرورش ایک مسلمان لڑکی کی حیثیت سے ایک مسلمان گھرانے میں ہوئی تھی، لیکن بعد میں وہ مرتد ہو گئی تھی، ان وجوہات کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر خواتین اسلام قبول کر رہی ہیں۔

ایوا احمد کا مرتد ہونا

مصنفہ ایوا احمد خود اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''میری پرورش ایک مسلمان لڑکی کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن میرے بچپن کا بیشتر زمانہ اسلام سے فرار حاصل کرنے میں ہی صرف ہوا۔ میری پیدائش لندن میں ایک انگریز ماں اور پاکستانی مسلمان باپ کے گھر میں ہوئی۔ میری پرورش اس طرح کی گئی کہ میں بغیر کوئی سوال کیے اپنے باپ کے مذہب کی پیروی کروں۔ لیکن در پردہ میں اس مذہب (اسلام) سے نفرت کرتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے جونہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا میں نے اس مذہب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔''

''جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے، میرے مسلمان ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میں ہر معاملے میں ''نا'' کا لفظ بار بار سنوں۔ مجھ جیسا پس منظر رکھنے والی لڑکیوں کو ایسی بہت سی چیزوں سے منع کر دیا گیا تھا جو میری انگریز دوستوں کو خود بخود مہیا ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت ہر شوخی اور خوشی کی بات مجھ جیسی لڑکیوں کے لیے منع تھی۔''

''بہت سی متفرق، چھوٹی چھوٹی پابندیاں تھیں سیٹی نہیں بجانی، چیونگ گم کی اجازت نہیں، سائیکل نہیں چلانی، پاپ میوزک نہیں دیکھنا، میک اپ نہیں کرنا، ایسا لباس نہیں پہننا جس میں بدن کے نشیب و فراز نمایاں ہوں، راہ چلتے کچھ کھانا نہیں، اپنی جیبوں میں ہاتھ نہیں ڈالنے، بال نہیں کٹوانے، نیل پالش نہیں لگانی، سوال نہیں کرنے، آگے سے جواب نہیں دینا۔ پالتو کتا نہیں رکھنا کہ یہ ناپاک ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ کسی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھنا، مردوں سے ہاتھ نہیں ملانا اور یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بھی نہیں۔''

''یہ سب بنیادی قوانین میرے باپ کی طرف سے مجھ پر نافذ کروائے گئے اور میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ ایک اچھا مسلمان ہونے کے لیے ان پر عمل کرنا لازمی ہے۔ پھر اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جونہی میں اس عمر کو پہنچی کہ میں اپنی

خودمختاری استعمال کرسکوں تو میں نے یہ سارا پیکج مسترد کر دیا اور اسلام سے منہ موڑ لیا ۔ آخر ایک جدید، آزادی پسند برطانوی عورت ایسی زندگی کیسے اختیار کرسکتی تھی۔'' ☆

☆ ایو کی اس کہانی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس پر پابندیاں تو عائد کیں لیکن اُسے اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، آخرت اور کائنات میں انسان کی حیثیت، نیکی اور بدی کا تصور، اور آخرت کی جوابدہی کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ نہ کیا اور کچھ پابندیاں ایسی بھی تھیں جو شریعت نے نہیں لگائیں۔(مترجم)

حیران کن مشاہدات

میرے اپنے ماضی سے قطع تعلق کے پس منظر میں جب میں دیکھتی ہوں کہ مغربی عورتوں کی روز افزوں تعداد اسلام قبول کر رہی ہے تو یہ بات میرے لیے بے حد حیرت کا موجب بنتی ہے۔ ایسے واقعات میں تازہ ترین اضافہ سابق وزیر اعظم برطانیہ ٹونی بلیئر کی خواہر نسبتی لورین بوتھ کا قبول اسلام ہے۔ میں نے ایسے بہت سے واقعات کا بے حد شوق اور تجسس سے تعاقب کرنے کی کوشش کی ہے۔

لورین بوتھ

۴۳ سالہ براڈ کاسٹر اور صحافیہ لورین بوتھ کہتی ہیں کہ وہ اب گھر سے باہر جاتے ہوئے سر ڈھانپنے کے لیے حجاب پہنتی ہیں، دن میں پانچ وقت نماز پڑھتی ہیں اور جب ممکن ہو مقامی مسجد میں نماز ادا کرتی ہیں۔ انھوں نے چھ ہفتے قبل اس وقت اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا جب وہ ایران کے شہر قم میں فاطمہ معصومہ کے مزار پر حاضر تھیں۔ ''وہ ایک منگل کی شام تھی، میں وہاں بیٹھ گئی، یہ ایک بے حد خوشگوار روحانی تجربہ تھا۔ قطعی شادمانی اور مسرت۔''

ایران میں اسلام کی تعلیمات سے باخبر ہونے سے پہلے بھی اسلام کے لیے ان کے دل میں ہمدردانہ جذبات تھے، اور انھوں نے بہت سا وقت فلسطین میں کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کام سے حاصل ہونے والی قوت اور سکون قلب بہت اثر انگیز تھا۔

میرے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ ایک عورت اس مذہب کی طرف کیسے مائل ہوئی جس نے مجھے ایک پست اور غلامانہ حیثیت دی۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ان خواتین کا اسلام کا تجربہ میرے تجربے سے اتنا مختلف تھا۔

سوان سی یونیورسٹی کے کیون برائس نے بھی میری طرح سفید فام لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر تحقیق کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے لوگ دراصل ایک پرفریب رجحان کا حصہ ہیں۔ یہ اعلیٰ روحانیت کے متلاشی اور گہری سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔ دوسری قسم ان خواتین کی ہے جو اپنی سہولت کے لیے اسلام قبول کرتی ہیں۔ وہ اپنے مسلمان شوہر اور اس کے خاندان کو خوش کرنے کے لیے مذہب کا صرف لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مسجد جائیں، نماز پڑھیں یا روزہ رکھیں۔

میں نے اسلام قبول کرنے والے مختلف سفید فام لوگوں سے اس نیت سے گفتگو کی ہے کہ میں اس مذہب کو دوبارہ پرکھوں جو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ ان میں لندن کی ۴۳ سالہ کرسٹین بیکر بھی ہے جو پروگرام کرتی رہی ہے اور جس نے

مغربی طرز کی ویسی ہی آزاد زندگی گزاری ہے جس کی میں کم عمری میں تمنا کیا کرتی تھی۔ لیکن پھر اس نے اس زندگی کو خیر باد کہہ دیا اور اس کی بجائے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا موقف ہے کہ اس آزاد خیال معاشرہ کی ہر وہ چیز جس کی وہ طمع کرتی رہی محض سطحیت اور خالی پن ثابت ہوئی۔

اقدار کی تبدیلی

۳۲ سالہ کیلالی لینڈ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب وہ لگ بھگ ۲۵ سال کی تھی اور اس کی اسلام قبول کرنے کی وجہ محض عقلی تھی اور یہ کہ اسلام میں اس کو اپنی نسوانیت کا تحفظ نظر آیا۔

کرسٹین بیکر

کرسٹین کی زندگی میں اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۹۲ء میں اس کا تعارف پاکستان کے کرکٹ کے کھلاڑی عمران خان سے ہوا۔ اس وقت وہ اپنے کیریئر کی بلندیوں پر تھی۔ وہ عمران خان کے ساتھ پاکستان بھی گئی جہاں اس کے مطابق وہ لوگوں کی روحانیت اور گرمجوشی سے بے حد متاثر ہوئی۔ کرسٹین نے مزید بتایا کہ ''اگرچہ عمران خان کے ساتھ دوستی کا تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہا لیکن میں نے دین اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا اور جلد ہی اسے قبول کر لیا۔ میری ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ میں اپنے ٹی وی پروگراموں کے لیے مشہور فلمی ستاروں کے انٹرویو کرتی، دنیا بھر میں سفر کرتی، ہر طرح کے میلانات کا مشاہدہ کرتی لیکن مجھے اپنا باطن بالکل خالی محسوس ہوتا تھا۔ اب بالآخر مجھے اطمینان کی دولت حاصل ہے اور اسلام نے مجھے زندگی کا ایک مقصد عطا کر دیا ہے۔ مغرب میں ہم بے حد سطحی تفکرات کا شکار ہوتے ہیں جیسے یہ فکر کہ آج کونسا لباس پہننا ہے۔ اسلام میں ہر کوئی سچا مومن ایک بلند مقصد پر نظر رکھتا ہے۔ ہر کام اللہ کو خوش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف نظام اقدار ہے۔''

''اپنی جدید زندگی کے باوجود مجھے اپنے اندر ایک خلا محسوس ہوا اور مجھے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ مسلمان ہونا ہی انسان کو سچی آزادی سے ہم کنار کرتا ہے۔ صرف ایک خدا کی بندگی کرنا انسانی زندگی کو پاکیزہ بنا دیتا ہے اور آپ ہر خبط کے پیچھے سرگرداں نہیں ہوتے۔''

''میں جرمنی کے ایک پروٹسٹنٹ خاندان میں پلی بڑھی جو کہ بہت مذہبی نہیں تھا۔ میں شراب بھی پیتی تھی اور مخلوط پارٹیوں میں شریک ہوتی تھی۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمیں ایک بہتر طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہماری آخرت کی زندگی سنور جائے۔ ہم سب اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہیں۔''

لِن علی

بہت سی عورتوں کا اسلام سے پہلا تعارف ان کے مسلمان بوائے فرینڈ سے دوستانہ ملاقاتوں کے دوران ہوا۔ ڈیگن ہیم ایسیکس کی ۳۱ سالہ لِن علی تسلیم کرتی ہیں کہ ایک زمانے میں وہ کثرت سے مخلوط پارٹیوں میں شرکت کرنے والی ایک سفید فام کم عمر لڑکی کا نمونہ تھیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ''میں باہر جاتی، دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرتی۔ جسم کو نمایاں کرنے والا تنگ لباس پہنتی اور لڑکوں کے ساتھ دوستانہ ملاقاتیں کرتی۔ میں نے کچھ عرصہ

جز وقتی طور پر ایک شراب خانے میں موسیقار کے طور پر بھی کام کیا۔ اس طرح میں پوری طرح شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کا حصہ رہی۔ عیسائی ہونے کی حیثیت سے کبھی کبھار میں عبادت بھی کر لیتی تھی۔ لیکن خدا کی حیثیت میرے لیے محض ایک ڈاکٹر کی سی تھی جو میری زندگی میں مشکل کے وقت میری مدد کر سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا تو میں اسے یہی بتاتی تھی۔ عام طور پر میں ایسی تیز روز زندگی گزارنے پر خوش تھی۔''

پھر اس کے بعد لِن کی ملاقات یونیورسٹی میں اپنے ایک بوائے فرینڈ زاہد سے ہوئی اور کوئی چیز ڈرامائی طور پر وقوع پذیر ہوئی۔ لِن کے بقول:

''زاہد کی ہمشیرہ نے اسلام کے بارے میں مجھے بتانا شروع کیا اور پھر مجھے ایسے لگا کہ میری زندگی کی ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر نصب ہوتی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں اس کی تہہ میں اصل بات یہ تھی کہ میں پہلے ہی کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جو مجھے اپنی سابقہ شراب نوشی اور پارٹی لائف طرزِ زندگی مہیا نہیں کر پا رہی تھی۔''

''میں نے ۱۹ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اسی دن سے میں نے حجاب اوڑھنا شروع کر دیا اور اب میں کبھی بھی گھر سے باہر اپنے بال ننگے نہیں کرتی۔ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے سامنے عام مغربی لباس بھی پہن لیتی ہوں لیکن گھر سے باہر کبھی نہیں۔''

سروے

حال ہی میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق نصف سے زائد برطانوی عوام یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام منفی اثرات کا حامل ہے جو انتہا پسندی کو فروغ دیتا ہے، اس میں عورتوں پر بہت پابندیاں ہیں اور انھیں مردوں کے مساوی حقوق نہیں دیے جاتے۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہی خواتین میں سے کچھ اسلام کا راستہ کیوں اختیار کرتی ہیں؟ پھر اعداد و شمار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنا کوئی اکا دکا واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک نمایاں پیش رفت ہے۔ بالآخر اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور اس کو قبول کرنے والے سفید فام لوگ اس معاملے کا اہم حصہ ہیں۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والی مغربی عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں دوگنی ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام لانے والی خواتین اپنے عقیدہ کی علامات پبلک میں نمایاں کرنے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں۔ یہ بات خصوصاً حجاب کے بارے میں ہے کہ بہت سی مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں جن کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی وہ بھی حجاب کی پابندی نہیں کرتیں لیکن نومسلم یورپی لڑکیاں اس کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں اور غالباً اسی لیے پیدائشی مسلمان لڑکیوں کے مقابلے میں وہ خاص طور پر لوگوں کے امتیازی سلوک کا نشانہ بنتی ہیں۔

کرسٹین بیکر

ایسا ہی کچھ کرسٹین بیکر کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ:

''جرمنی میں لوگوں کے دلوں میں اسلام کا خوف ہے۔ میں جب مسلمان ہوئی تو میری ملازمت جاتی رہی۔ میرے

خلاف پریس میں ایک مہم شروع ہوگئی، اور تمام مسلمانوں کو دہشت گردی کے حامی قرار دیا گیا۔ میری تذلیل کی گئی۔ اب میں این بی سی یورپ پر ریڈیو پروگرام کرتی ہوں۔"

"میں اپنے آپ کو پیدائشی مسلمانوں کے مقابلے میں یورپی مسلمان کہتی ہوں۔ میں نے ایک مراکشی مسلم نوجوان سے شادی کی لیکن یہ شادی چل نہ سکی کیونکہ میرا شوہر مجھ پر بے جا پابندیاں عائد کرتا تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کی پرورش ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی۔ ایک یورپی مسلمان ہونے کی وجہ سے میں ہر بات کو پرکھتی ہوں، اس کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتی۔"

"لیکن جو چیز مجھے بے حد پسند ہے وہ مسلم قوم کی گرمجوشی ہے۔ لندن تمام یورپ میں مسلمانوں کے لیے رہنے کی بہترین جگہ ہے۔ یہاں بہت عمدہ اسلامی کلچر ہے اور میں یہاں رہ کر بے حد خوش ہوں کچھ یورپی نومسلموں کے لیے اسلام قدیم طرز کی خاندانی اقدار کے خوشگوار احیا کا ذریعہ ہے۔"

حیفاء جواد

برمنگھم یونیورسٹی کی سینئر لیکچرر حیفاء جواد کہتی ہیں کہ:

"کچھ لوگ اسلام میں اپنائیت اور قومیت کے احساس سے متاثر ہو کر اس مذہب میں کشش محسوس کرتے ہیں، یہ ایسی اقدار ہیں جو مغرب میں نایاب ہو چکی ہیں مثال کے طور پر زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اس بات پر ماتم کرتے ہیں کہ مغربی معاشرہ میں بزرگوں اور عورتوں کے لیے روایتی عزت و احترام باقی نہیں رہا۔ یہ ایسی اقدار ہیں جن کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کی پابندی ضروری ہے۔"

کامیلا لی لینڈ

اسلام کی ایسی ہی اقدار ہیں جن سے متاثر ہو کر ۳۲ سالہ کامیلا لی لینڈ اسلام کی طرف مائل ہوئیں۔ وہ کارنوال میں رہتی ہیں اور یوگا کی استاد ہیں۔ تقریباً ۲۵ سال کی عمر میں جبکہ وہ ایک دو سالہ بچی عنایہ کی مجرد ماں تھیں انھوں نے اسلام اس لیے قبول کیا کہ اس مذہب کی بنیاد عقل و فہم پر ہے اور اس میں نسوانیت کا تحفظ ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ لوگ ایک ہی سانس میں نسوانیت اور اسلام کے الفاظ سن کر حیران ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ قرآنی تعلیمات میں عورتوں کو مساوی حقوق دیے گئے ہیں۔ اور جب اس مذہب کی بنیاد پڑی تو اس وقت اس معاشرے میں عورت سے سخت نفرت کی جاتی تھی اور اسلامی تعلیمات اس کے خلاف جاتی تھیں۔"

"ایک بڑی غلطی جو لوگ کرتے ہیں وہ کلچر کو مذہب سے گڈ مڈ کرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے مسلم معاشروں میں عورت کو انفرادی آزادی حاصل نہیں ہے مگر میں بھی تو ایک مغربی معاشرے میں پروان چڑھ رہی تھی تو میں نے اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ اس مغربی معاشرے کے جبر کا شکار پایا۔ یہاں عورت پر یہ دباؤ ہے کہ وہ مردوں کے طور طریقے اپنائے، اسی طرح شراب پیئے اور جنسی بے راہ روی میں ملوث ہو۔ یہ سب کچھ ایک بے معنی طرزِ عمل ہے۔ اسلام میں اگر آپ کسی سے تعلق کا اظہار کرتے ہیں تو وہ صرف اس حد تک ہے کہ آپ اس سے نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کریں۔"

کامیلا ساؤتھمپٹن میں پلی بڑھی اس کے والد ساؤتھمپٹن انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے ڈائریکٹر تھے اور والدہ ہوم اکنامکس کی استاد تھیں۔ کامیلا کی اسلام میں دلچسپی اسکول کے زمانے سے تھی۔ پھر وہ یونیورسٹی چلی گئی اور مڈل ایسٹ اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری لی۔لیکن اسے اصل روحانی القاء اس وقت ہوا جب وہ شام میں ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر تھی۔اس نے جو کچھ قرآن میں پڑھا تھا اس کے نتیجے میں اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کے فیصلے نے اس کے دوستوں اور خاندان کو ششدر کر دیا۔لوگوں کے لیے یہ تسلیم کرنا بے حد مشکل تھا کہ متوسط طبقہ کی ایک تعلیم یافتہ سفید فام عورت نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگرچہ کامیلا کا ایمان ہمیشہ کی طرح مضبوط ہے لیکن وہ پبلک میں حجاب استعمال نہیں کرتی۔لیکن بہت سی خواتین جن سے میں نے بات کی انھوں نے یہی کہا کہ اسلامی لباس ہمارے لیے قوت اور آزادی کا ذریعہ ہے۔لن علی کو وہ رات یاد ہے جب یہ بات اس کے ذہن نشین ہوئی اس کے بقول:

''میں اپنی ایک پرانی دوست کی اکیسویں برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے لیے ایک شراب خانے میں گئی۔ میں اپنا حجاب اور باوقار لباس پہن کر اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کس طرح ہر کسی نے وافر مقدار میں اپنے انسانی گوشت کو عریاں کررکھا تھا۔وہ شراب کے نشے میں دھت تھے،اول فول بول رہے تھے اور ایک دوسرے کو اکسانے والے انداز میں ناچ رہے تھے۔اس روز میں نے پہلی مرتبہ اپنی پرانی زندگی کو ایک اجنبی کی حیثیت سے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور میں نے یہ جان لیا کہ میں کبھی بھی واپس اس کی طرف پلٹ کر نہیں جاسکتی۔میں اپنی موجودہ طرزِ زندگی کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس گندگی سے نجات دی۔یہی میری اصلی ہیئت ہے میں بے حد خوش ہوں کہ پانچ وقت نماز ادا کرتی ہوں اور مسجد میں کلاس پڑھاتی ہوں۔اب میں اس شکستہ معاشرے اور اس کی توقعات کی غلام کبھی نہیں ہوسکتی۔''

کرسٹین بیکر نے اپنے روحانی سفر کے موضوع پر کتاب لکھی ہے۔جس کا عنوان ہے''ایم ٹی وی سے مکہ تک''۔ان کا خیال ہے کہ جدید خودمختار نسل کے مسلمان ایک تنظیم بنا کر دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ ہم نے اس روایتی اسلام کے تحت پرورش نہیں پائی جو عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ:

''میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو مسلم گھرانے میں پیدا ہوئیں لیکن پھر اس کے بعد وہ اسلام سے متنفر اور باغی ہوگئیں۔ اگر آپ ذرا گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اسلامی عقیدے سے باغی نہیں ہوئیں بلکہ اس کلچر سے جو ان پر مسلط کیا گیا۔یہ قاعدہ کہ صرف اپنے مسلک اور ذات کے لوگوں میں شادی ہوسکتی ہے یا یہ کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم کی اتنی اہمیت نہیں ہے کیونکہ انھوں نے بالآخر شادی کرنی ہے۔ یہ سب باتیں قرآن میں کہاں ہیں؟ کہیں بھی نہیں۔''

''بہت سے نوجوان مسلمانوں نے اس روایتی اسلام کو ترک کر دیا ہے جس کے سائے میں وہ پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے زیادہ روحانی اور تعقل پر مبنی انداز اپنایا ہے جو کہ پرانی نسل کے روایتی تہذیبی تصورات سے مبرا ہے۔ میں نے

بھی اپنی زندگی اسی طرح گزارنے کا ارادہ کرلیا ہے تاکہ لوگوں کو اسلام کی اصل خوبصورتی دکھا سکوں۔''

مصنفہ ایوا احمد

''اگرچہ اس مضمون کے لیے انٹرویو کی گئی خواتین کے جذبات سے میں اتفاق نہیں کرتی لیکن میں ان کی ستائش بھی کرتی ہوں اور عزت بھی۔ وہ سب ذہین اور تعلیم یافتہ خواتین ہیں اور انھوں نے طویل اور گہری سوچ کے بعد ہی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اب قبول کئے ہوئے اس مذہب کے بارے میں بہت پرجوش احساسات رکھتی ہیں۔ وہ سب خوش رہیں۔ لورین بوتھ بھی خوش رہیں۔ لیکن صرف ایک لفظ ہے جو میرے اور ان کے تجربات کا فرق بتا سکتا ہے اور وہ ہے ''انتخاب''!

شاید اگر میں اپنے آپ کو بااختیار محسوس کرتی اور یہ نہ سمجھتی کہ مجھ پر کسی اور کا کنٹرول ہے، اگر میں اپنے آپ کو قوی محسوس کرتی یہ نہ سمجھتی کہ میرا گلا گھونٹا جا رہا ہے، تو میں اب بھی اسی مذہب پر قائم ہوتی جو میرا پیدائشی مذہب تھا اور احساس جرم کا وہ بوجھ نہ اٹھائے ہوئے ہوتی جو اپنے باپ کے مذہب کو مسترد کر کے اب اٹھائے پھرتی ہوں۔''

(ڈیلی میل)

زندگی ٹھہر ذرا!

زندگی ٹھہر ذرا میں بھی ترا دم بھر لوں
سرِ تسلیم محبت میں تری خم کر لوں
دلِ ناشاد میں پیدا تری چاہت کر لوں
ایک دو پل ہی سہی تجھ سے محبت کر لوں
مر نہ جاؤں تری الفت کا میں ارمان لئے
چلنا اچھا نہیں لگتا بنا سامان لئے
کیا سجے زندگی اقرارِ محبت کے بغیر
خواہش سیر نہ ہو جب تلک، ہوتی نہیں سیر
کیا پتہ کون سے موسم میں بچھڑ جاؤں میں
اندھے انجان سے کس موڑ پہ مڑ جاؤں میں
تجھ سے الفت کی تمنا ہے شرارے کی طرح
جل بجھے یہ نہ کہیں ٹوٹے ستارے کی طرح
چاہنے کی تجھے جاگی ہے تمنا دل میں
لگتا ہے سبزہ اُگنے لگا پتھر سل میں
زندگانی تجھے بیکار کہا کیوں میں نے
کاوشِ زیست کو بیگار کہا کیوں میں نے

جلوہِ حسن ترا صرفِ نگہ میں نے کیا
جانے کیا بات تھی کیوں ایسا گنہ میں نے کیا
کیوں کٹھن مجھ کو لگا عمرِ رواں ساتھ ترا
اتنا بے مہر تو ہرگز بھی نہ تھا ہاتھ ترا
کیوں بھلا کے نہ جفا جور کو بیماری کو
ظالم انسانوں کی مجبوروں پہ قہاری کو
نظروں کو پھیر کے ہر جھلسے ہوئے منظر سے
کیوں نہ آسودہ کیا خود کو گلِ خوش تر سے
میں نے کیوں تیری بہاروں کا قصیدہ نہ لکھا
کیوں تجھے راحت و آرام چشیدہ نہ لکھا
اپنی بے خبری کی میں تجھ سے تلافی چاہوں
حق تعالیٰ سے خطاؤں کی معافی چاہوں
زندگی ٹھہر جا میں بھی تجھے جاناں کہہ لوں
خاروخس کو بھی ترے سنبل وریحاں کہہ لوں
بے وفا تجھ سے نباہ کرنے کی ہمت کر لوں
ایک دو پل ہی سہی تجھ سے محبت کر لوں!

نجمہ یاسمین یوسف

تو کیا!!

(ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے سانحے پر)

تو کیا ایمان اور انصاف
یوں بکنے لگیں گے!
عدالت اور شہادت کے
کوئی معنی نہیں ہوں گے!
تو کیا اب جرم پر کوئی سزا
نافذ نہیں ہوگی!!
کسی مجرم پہ فردِ جرم
اب عائد نہیں ہوگی!
کسی قاتل کو اب پھانسی نہیں ہوگی!
تو کیا انصاف کی دہلیز پر بھی
عدل کی تقسیم اب ممکن نہیں ہوگی!
تو کیا اب منصفی سچائی کے
تابع نہیں ہوگی!!
کوئی بھی فیصلہ انصاف پر
مبنی نہیں ہوگا!
تو کیا!!

شمیم فاطمہ

غزل

ہولے ہولے ڈھانپ رہی ہے رات ہمیں انجانے میں
لوگ بہت مصروف ہیں سارے اک دوجے کو جگانے میں

تم کیا جانو بند آنکھوں پر کیا کیا صدمے ٹوٹتے ہیں
عمر گزر جاتی ہے صاحب، خواب کا بوجھ اٹھانے میں

ورنہ خاک پہ نقش گری ہی کرتے عمر گزاری ہے
آپ آئے تو رنگوں کی بھی بات چلی ویرانے میں

یہ لمحہ جو آخرِ شب کی وحشت میں مجھ تک پہنچا
جانے کتنی عمر لگے گی اس لمحے کو بتانے میں

موج، ہوا، ساحل کی حیرت سے آگے بھی دنیا ہے
جیسے موتی سیپ میں، جیسے خوشبو اس کا شانے میں

اندر اندر سے اب اس کی یاد کا رستہ ڈھونڈ لیا ہے
یونہی تکلف سا رہتا تھا آنکھ کے رستے جانے میں

صہیب اکرام

غزل

طرز گفتار ہو ایسی کہ زمانہ سمجھے
واقعہ ایسا نہ ہو جس کو فسانہ سمجھے

دردِ دل دردِ جگر دردِ محبت والو
پھر نئی بات کہو جس کو زمانہ سمجھے

عشق کی راہ میں چلنا کوئی آسان نہیں
دیکھو بیگانۂ الفت نہ زمانہ سمجھے

زلفِ گیتی کا سنورنا کوئی آسان نہیں
جو سنوارے وہی سمجھے نہ، تو شانہ سمجھے ؟

کس طرح دل کو بچائے کوئی محفل میں شہودؔ
کون اُن شوخ نگاہوں کا نشانہ سمجھے

شہود ہاشمی۔ ریاض

غزل

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

تم ستمگر ہو نہ گھبراؤ مری حالت پر
زخم سہنے کا ابھی مجھ میں ہنر باقی ہے

ہجر کی آگ میں جلنے سے نہیں ڈرتی میں
عشق مجھ میں ابھی بے خوف وخطر باقی ہے

میرے تنکے بھی ہوئے راکھ تو کیا حرج بھلا
آتشِ عشق بتا کتنا یہ گھر باقی ہے

سانس لینا ہی تو شاہینؔ نہیں ہے جیون
ڈھونڈ کر لاؤ مری روح اگر باقی ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

قیمت

توے تلے لپکنے والے شعلے وقتاً فوقتاً نمودار ہوتے تو وہ توے پر ڈالی گئی روٹی کو ہاتھ سے ذرا پرے کھسکا دیتی۔ پسینہ اسکے مساموں سے پانی کی طرح بہتا اور لان کی قمیض اس کے وجود کے ساتھ چپک جاتی۔ چولہے سے کچھ ہی فاصلے پر چمکتی دھوپ کا ٹکڑا بتدریج بڑھتا جاتا۔ اس کے روٹی شروع کرنے سے پہلے وہ تین گز کی دوری پر ہوتا لیکن جیسے جیسے پکائی گئی روٹی کا ڈھیر اونچا ہوتا رہتا ویسے ویسے دھوپ بھی اس کے قریب آتی رہتی۔ آخری آٹھ دس روٹیوں سے قبل وہ اتنی بے حال ہو جاتی کہ بیلن چھوڑ کر سامنے لگے نل سے جو پودوں کو پانی دینے کے کام آتا تھا، منہ پر چھپکے مارتے ہوئے ہتھیلی کی اوک سے دو چار گھونٹ لے کر ہی پلٹتی۔

گھر کے کچن میں کھڑی بلقیس سمیع کی جب بھی روٹیاں پکاتے اس وجود پر نگاہ پڑتی تو بے اختیار استغفر اللہ، پڑھنا نہ بھولتیں۔ ڈھلکا ہوا گلا، آدھے بازو کی قمیض، اس پر حرکت کرتے، بنا دوپٹہ اوڑھے بدن کے خاصے قابل اعتراض مناظر...... ناگواری کے احساسات کے ساتھ وہ اپنا لمبا چوڑا نرم وملائم لان کے سوٹ کا دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی ناشتے کی تیاری میں لگ جاتیں۔ آم، اسٹرابری، چیکو، کیلے، دہی یا صندل کے شربت سے بنے فرحت بخش شیک تیار کر کے وہ ان میں برف کی ڈلیاں ڈال رہی ہوتی تو سامنے روٹیاں پک چکی ہوتیں اور پکانے والی بیٹھی انہیں گن گن کر چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں سی بنا کر تیزی سے علیحدہ کر رہی ہوتی، جنہیں پھر وہ دائیں، بائیں بنے ہوئے بیگم رشدہ رفیع اور بیگم کنزیٰ حلیمکے پورشن پر دے دیتی۔ تینوں بھائیوں کے اس مشترکہ احاطے میں روٹی پکنے کی جگہ ہمیشہ سے یہی تھی۔ سروقد بلقیس جب سے بیاہ کر آئی تھیں انہوں نے مختلف عورتوں کو روٹی پکاتے دیکھا تھا ۔مگر اس طرح کھڑے ہو کر تجزیہ کرنے کا نہ انہیں شوق تھا اور نہ انکے پاس وقت۔ یہ تو بھلا ہو کچن میں اس تبدیلی کا جو کچھ ہی عرصہ قبل کرائی گئی تھی۔ ایک نئی کھڑکی بنی تو روٹی پکانے کا منظر بھی سامنے آ گیا۔

''پتہ نہیں دیدوں کا پانی کیسے ڈھل جاتا ہے'' ذرا لحاظ نہیں گھر کا کھلا حصہ ہے، دائیں بائیں مرد ہیں، دوپٹہ سے بے نیاز ہو کر ایسے کام کرتی ہے جیسے کوئی ڈھکی چھپی جگہ ہو۔''

بڑبڑاتی ہوئی وہ اس دن عین کھڑکی کے پاس کھڑی میاں کی فرمائش پر لیچی چھیل کر اسکا شربت بناتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائیں تو کھڑکی کے باہر گھر کے پچھلے حصے میں موجود اس روٹی پکاتے وجود نے نگاہ اٹھا کر بے اختیار کچن کی جانب دیکھا جہاں چلتا پنکھا تیز ترین رفتار سے بے آواز گھوم رہا تھا۔ بیگم بلقیس سمیع کا ہوا سے پھڑپھڑاتا دوپٹہ انکے کام میں

رکاوٹ بننے لگا تو انہوں نے اسے قریبی کرسی پر ٹانگ دیا۔ خوبصورت دودھیا سڈول بازوؤں پر آستینیں چڑھائے کام کرتی بلقیس سمیع کی سنہری چوڑیوں پر لحہ بھر کو اس کی نگاہ ٹھہری مگر فوراً ہی وہ دوبارہ اپنے کام پر متوجہ ہوگئی۔ اس کی زندگی میں سوچنے سمجھنے کا کوئی لحہ میسر نہیں تھا۔ وہ کیا برا مانے اور کیا نہیں یہ سوچنے کا موقع بھی اسے نہ ملتا تھا۔ مشقت تھکان اور پھر مشقت۔ حسب معمول اپنا کام ختم کر کے وہ اٹھی اور پانی کے دو چار گھونٹ ایک بار پھر نل سے پی کر دوپٹہ پھیلا کر سر پر ڈالتی ہوئی وہ کھڑی ہوگئی ''چلتی کہاں ہے لگتا ہے دوڑتی ہے''، اس کو دائیں جانب بیگم رشیدہ کی طرف جاتا دیکھ کر بیگم بلقیس سمیع نے ایک بار پھر دل میں اعتراض کیا ''ڈھنگ سے چلا کرے جسم کا انگ انگ واضح ہوتا ہے اسکا'' ایک اور بدمزہ تجزیہ ابھرا۔

کام والی لڑکی سنک میں کھڑی برتن دھو رہی تھی، لیچی کے پھل کی میٹھی خوشبو باہر سے آتی دھوپ کی چمک کے ساتھ مدغم ہو رہی تھی۔ چلمن سے بنے بلائنڈز گراتے ہوئے بیگم بلقیس سمیع نے میاں کو ناشتے کی میز پر آتے دیکھا تو اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کلون کا ایک جھونکا سمیع صاحب کے آتے ہی آیا جس نے ماحول کو تروتازہ سا کر دیا۔ کام کرنے والی لڑکی نے ہاتھ روک کر دلفریب سی خوشبو کو ایک گہرا سانس لے کر اپنے اندر اتارا بے اختیار اس کے دل میں خوشبو کا نام جاننے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ''باجی سے پوچھونگی اور فیصل کو خرید کر دونگی'' دل کی خواہش فیصل کے لئے ابھرتے ہی اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ برتن دھو کر وہ اپنے آپ کو سمیٹتی نیچی نظروں سے کچن سے باہر نکلی تو بیگم صاحبہ کی نظروں میں اس کے لیے تعریف تھی ''ایک یہ ہے، ایک وہ ہے!'' انہوں نے موازنہ کیا۔ لڑکی اب انکے گھر کے اندرونی حصے کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ پھرتی سے یہاں وہاں کے کام نمٹاتی وہ ادھر اُدھر آ جا رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے بلقیس سمیع اس پر نگاہ ڈالتیں اور سمیع صاحب کے ساتھ ناشتے کی میز پر حالات حاضرہ اور ابتر معاشرہ پر گفتگو کرتے ہوئے گھونٹ گھونٹ مشروب سے لطف اندوز ہوتیں۔ بدامنی اور سنگین معاشی صورتحال پر خاصا دقیق تبصرہ کیا جاتا اور ''اللہ رحم کرے اپنا'' بڑی دلسوزی سے کہتے ہوئے وہ میاں کے آگے ان کی پسندیدہ الائچیاں رکھتے ہوئے کچن کے جائزہ میں مصروف ہو جاتیں۔ کچھ ہی دیر بعد ان کو اپنی این جی او کے دفتر کی جانب روانہ ہو جانا ہوتا جو یتیم بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنائی گئی تھی۔ گھر کے نوکروں کو صفائی ستھرائی اور دن بھر کے کھانے کے مینو کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے وہ ہلکے پھلکے کام بھی نمٹاتی رہتیں۔ کٹے کٹائے پالک کو بھون دیا۔ ابلے ہوئے آلوؤں کو چھل کر نمک ملایا اور کٹر سے طرح طرح کی شکلیں بنا کر فریج میں رکھ دیا۔ کپڑوں کی الماری کے آگے کھڑے ہو کر نئے پرانے کپڑوں کی چھانٹی کی۔ زیادہ کپڑا الماری میں بھرنے سے انہیں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ تیزی سے آئے دن نیا کپڑا بناتیں اور پرانا احادیث کے مطابق کسی نہ کسی ضرورت مند کو عطا کر دیتیں۔ نیا کپڑا بنانے کی مصروفیت بھی ہوتی۔ خریدنا، سلوانا اور سلوانے سے پہلے اس کی پر وقار مینا کاری کے لئے اشیا کی خریداری...... کام سا کام تھا ان کی زندگی میں، فارغ تو وہ نظر ہی نہ آتی تھیں۔ ہر وقت متحرک ہر وقت الرٹ جمال

اور کمال کے ساتھ ہم آہنگ، اپنی ساس کی طرح وہ بھی تین بیٹوں کی ماں تھیں۔ تینوں ہی قابل فخر تھے۔ باادب بانصیب، شہر کے گراں ترین اداروں میں پڑھنے والے، والدین کے فرمانبردار بچے نعمت ہی تو تھے۔ منجھلے کی خواہش پر پچھلے ہفتہ ہی نئے ماڈل کی گاڑی لی گئی تھی۔

''اللہ جمیل ہے، اور جمال کو پسند کرتا ہے'' گاڑیوں کے شوروم میں بیٹے کی پسند کی قیمت جاننے کے بعد انہوں نے دل کو اور میاں کو تسلی دی جو شہر کے دگرگوں حالات کی بنا پر سرمایہ کو انتہائی گراں قیمت گاڑی خرید کر منجمد کرنے کے حق میں نہ تھے۔

''نعمت خداوندی کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے، اب فیملی سمیت عمرہ کا پروگرام بنا لیں'' نئی گاڑی کی سبک رفتار ڈرائیو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ میاں سے بے اختیار کہہ اٹھیں جسے انہوں نے بلا تامل قبول کرلیا۔ ہزار ہزار کے کچھ نوٹ بھی بیگم بلقیس سمیع نے صدقہ کی نیت سے اسی وقت علیحدہ کرلئے ''اللہ نظر بد سے بچائے آمین'' منہ ہی منہ میں انہوں نے کہا اور آنے والے دنوں کا تصور کرنے لگیں جب بیت اللہ اور مقامات مقدسہ پر حاضری دے سکیں گی۔

☆......☆......☆

وقت کی کمی کا گلہ عموماً کیا جاتا ہے لیکن فجر سے دن کا آغاز کردیا جائے تو یہ گلے خاصی حد تک ختم ہوجاتے ہیں۔ بیگم بلقیس سمیع بھی فجر کی نماز کے بعد اپنے بیڈروم سے باہر آئیں تو خاصی خنکی کا احساس ہوا۔ لاؤنج کا اسپلٹ لگتا تھا لمحہ بھر قبل ہی بند کیا گیا ہو۔ انہوں نے حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے نگاہ دوڑائی تو بڑے بیٹے کے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین پر نگاہ ٹھہر گئی۔ عنقریب اس کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں روبوٹکس (Robotics) پر کوئی مقابلہ ہونے والا تھا، وہ شاید کمرے میں دوسرے بھائیوں کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے یہاں بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ میکینیکل آرم (mechanical arm) کی تصویر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نمایاں تھی اور پھر سکرین سیور چلنا شروع ہوگیا تھا۔ انہوں نے اولاد کے لئے دل میں ڈھیروں فخر محسوس کرتے ہوئے موتیا کے کچھ پھول توڑنے کے لئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ گرمی کا واضح احساس صبح ہی سے ہو رہا تھا۔ پودوں اور پھولوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مالی کے لئے کچھ ہدایتیں اور شکایتیں دل میں جمع کیں۔

''بہت ہی لاپروا آدمی ہے، موتیے کے پودے میں کیڑا لگ رہا ہے'' جو پودا پھولوں سے لدا ہوتا تھا، اس میں سے وہ بہ مشکل چند ہی پھول چن سکیں۔

''سلام بیگم صاحبہ'' اندرونی حصے کی طرف بڑھتی وہ چونک گئیں، آنچل کو چہرے پر ڈھلکاتے ہوئے وہ ترچھے رخ پر کھڑی ہوگئیں۔

''بیگم صاحبہ پودوں میں کیڑا لگ رہا ہے دوائی کے لئے پیسے چاہئیں تھے۔ دن ہو گئے میں دوائی ڈال ہی نہیں پایا۔ میرے سانس میں چڑھتی ہے تو کھانسی ہوجاتی ہے'' مالی نے بیگم صاحبہ کے بولنے سے قبل ہی اپنی بے توجہی کی وجوہات بیان کرنا شروع کردیں۔ بات ختم ہوتے ہی اسے کھانسی اٹھی اور وہ دل میں جز بز ہوتی آگے بڑھنے لگیں۔

''بیگم صاحبہ تنخواہ میں اضافہ کردیں بڑی مہربانی ہوگی۔مہنگائی بہت ہوگئی ہے''اس نے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر مسکین سی آواز میں کہا اور ایک بار پھر کھانسی کا شور اٹھایا۔بیگم بلقیس سمیع کے ذوق لطیف پر اس کی کھانسی خاصی گراں تھی جس میں بلغم بھی بھرا لگ رہا تھا۔''اب تو معمولی کھانسی کی دوائی بھی لینے جاؤ تو سو پچاس اُٹھ جاتے ہیں ہر مہینے، بچوں کے اسکول کی فیس بھی پورے سو روپے بڑھ گئی ہے۔ہمارا آسرا تو بس آپ ہی لوگ ہیں ورنہ ہم نہ دوا دارو کرسکیں اور نہ ہمارا بچہ کتاب پڑھ سکے۔''

بیگم بلقیس سمیع نے اس کے مطالبے کو ہونٹ بھینچ کر سنا''پیسوں کی اتنی کمی ہے تو کیا ضرورت تھی نئی سائیکل خریدنے کی اور سارے خاندان کے ساتھ ٹھٹہ پکنک کی۔سنبھل کر خرچ کرتے نہیں پھر روتے ہو!''

ان کی آواز میں سختی واضح تھی۔اس کی پودوں سے بے توجہی نے ان کو کلفت زدہ کر رکھا تھا''یہ سائیکل! بیگم صاحبہ جی یہ تو میرا روزگار ہے،شوق نہیں۔ہم جیسے، بچے نہیں پال سکتے، شوق کیا پالیں گے۔''

بیگم بلقیس سمیع کو لگا اس نے یہ کہتے ہوئے ان کی نئی چمچماتی ہوئی گاڑی کی جانب بھی دیکھا تھا جو سامنے ہی کھڑی تھی جس کے ساتھ ان کی اپنی چھوٹی گاڑی بھی موجود تھی، سالوں پرانی مگر قیمتی۔''توبہ کیسی نگاہوں سے دیکھا ہے اس نے۔اللہ محفوظ رکھے''تشویش سے سوچتے ہوئے بنا جواب دیئے وہ آگے بڑھ گئیں۔اگلے دن مہینہ کی تنخواہ دیتے ہوئے انہوں نے مالی کی تنخواہ میں پورے سو روپے کا اضافہ کر دیا تھا جسے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس اضافہ سے بھی وہ بیٹری سے چلنے والا ایک پنکھا نہیں خرید سکتا جو بجلی نہ ہونے کی صورت میں اس کے ننھے بچوں کے کام آسکے۔اس سو روپے کا کچھ کلو آٹا لے یا چینی؟ گرمی سے بے حال بچے اس کی نگاہوں کے سامنے آئے تو وہ افسردہ ہوگیا''دل کرتا ہے آگ لگا دوں پوری دنیا کو تا کہ قصہ ہی ختم ہوجائے''اس خیال کے زیر اثر اس نے پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے قینچی سے ہری بھری ٹہنی ہی کاٹ ڈالی۔ایکدم اسے ہوش آیا تو وہ سر سبز حصہ پودے سے الگ ہوا بے جان زمین پر پڑا تھا۔

دھوپ میں تپش شروع ہوچکی تھی۔روٹی پکنے کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی پھیل رہی تھی۔بیگم بلقیس سمیع نے حسب معمول کچن کی کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی اور زیر لب''استغفار'' بھی پڑھ ڈالی۔انہوں نے آج روٹی والی سے بات کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔پودوں کو پانی دیتے مالی نے بیگم صاحبہ کو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پایا تو اپنا رخ روٹی پکنے کے منظر سے ہٹا کر دوسری جانب کرلیا۔ایک وہ تھی دنیا سے جیسے بے خبر ہو کر اپنے کام میں جتی تھی۔

جب تک بلقیس سمیع ناشتہ میز پر لگا کر فارغ ہوئیں وہ ان کی روٹیاں رکھنے اندر آچکی تھی''روبینہ اپنے آپ کا دھیان کرو، مرد ہیں گھر میں۔دوپٹہ سے لاپروائی شریف عورتیں کا شیوہ نہیں''حتی الامکان انہوں نے مناسب الفاظ چننا چاہے تھے۔

روبینہ نے ٹھنڈے سائے میں کھڑی بیگم کے ارشاد کو سنا جو چولہے پر رکھے نان اسٹک فرائنگ پین میں زیتون کے تیل

کی بوتل سے دو چار قطرے ٹپکا رہی تھیں۔ان کے سر پر جما ہلکا کاسنی دوپٹہ اسی پرنٹ کا تھا جو کل اس کی بیٹی پورے پانچ سو روپے خرچ کر کے لائی تھی، اور اس نے بیٹی کو اتنے پیسے لان کے ایک سوٹ پر خرچ کرنے پر سخت ڈانٹا تھا'' امی اس کا اصلی پرنٹ تو پورے ڈھائی ہزار کا ہے یہ تو سستا مل گیا، نقلی ہے نا!'' وہ صفایاں دیتی روہانسی ہوگئی تھی۔اب بیگم بلقیس وہی پرنٹ پہنے ہیں جو یقیناً اصلی ہوگا۔رنگوں کی خوبصورتی ہی اور ہے۔ کپڑے کی نرمی بھی اور ہوگی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ انکے دوپٹہ کا پلو چھو کر دیکھے شرافت کا درس اس کے کانوں نے سن ضرور لیا تھا مگر خیالات اسکو کہیں کا کہیں پہنچا چکے تھے۔'' پورے ڈھائی ہزار کا سوٹ! ڈھائی ہزار میرے پاس بچیں تو میں پنجاب نہ ہو آؤں، اماں سے ملے کتنا عرصہ بیت چکا ہے۔ دو سال سے زیادہ ہو گیا جب سے کسی کی شکل بھی نہیں دیکھی'' روبینہ کا دل بھر آیا۔نمی سی اس کی آنکھوں میں پھیل گئی اور وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

آملیٹ زیتون کے تیل کی بوندوں میں سنہری سنہری چلتیوں کے ساتھ تیار ہو چکا تھا انہوں نے پلیٹ میں نکالتے ہوئے روبینہ کو جاتے ہوئے دیکھا اور بدمزہ ہوگئیں۔

''سوچا تھا دو چار باتیں کر کے یہ سوٹ اسے پکڑا دونگی۔ پوری آستینیں اور غف کپڑا'' اپنے پہنے ہوئے تین لان کے سوٹ ہمیشہ کی طرح الماری کی چھانٹی کرتے ہوئے انہوں نے نکالے تھے'' پر یہ عورت! اس کے تو مزاج ہی اور ہیں'' بیگم بلقیس کو جی بھر کر برا لگا تھا۔اور وہ پانچ چھ ہزار کے پہنے ہوئے کپڑے یونہی رکھے رہ گئے مگر افسوس ان سے کسی آنکھ کی نمی اور کسی دل کی آہ کا مداوا نہ ہوسکتا تھا۔

''دیکھو ذرا یہ اشتہار گردوں کے فلاحی ہسپتال کی جانب سے ہے۔بجلی کی بدترین صورتحال کی بنا پر جنریٹر خریدنے کے لئے لوگوں سے اعانت کی اپیل کی گئی ہے۔''

سمیع صاحب نے بیوی کے بنائے آملیٹ کی پلیٹ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔ بارہ لاکھ کے جنریٹر کے لئے اشتہار دیا گیا تھا۔اشتہار میں بستر پر لیٹے مریض وجود کی انتظار کرتی آنکھیں بلقیس سمیع کے دل کو پریشان کرنے لگیں تو انہوں نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔'' کتنا مہنگا ہے ......لیکن ضروری کتنا ہے! اللہ کرے جلد از جلد انتظام ہو جائے ......مریض کی زندگی مشین کے تار سے جڑی ہے اور مشین کی زندگی بجلی ہے۔''

دونوں میاں بیوی کے جملے دھلے برتن کپڑے سے پونچھ پونچھ کر کیبنٹ میں رکھتی لڑکی کے کانوں میں بھی پہنچ رہے تھے۔اس کو گردوں کے مریضوں سے زیادہ اس خوشبو سے دلچسپی تھی جو سمیع صاحب کے پاس سے آرہی تھی'' آج والی مختلف ہے اور زیادہ اچھی!'' فیصل یہ والی لگائے تو دہی جیسی کھٹی بساند اس کے پاس سے نہ آیا کرے'' لڑکی نے بے اختیار پسینے میں بھرے اپنے شوہر کا تصور کیا جس کو کام سے واپسی پر نہانے کے لئے روز پانی بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

''میرا تو نصیب ہی کھوٹا ہے جو فیصل جیسے شخص سے میرا بیاہ ہو گیا۔نہ صفائی ستھرائی کا شوق نہ بننے سنورنے کا۔''

خوشبو اپنے اندر اتارتی وہ یہ بھول چکی تھی کہ یہ وہی فیصل ہے کہ جس کی وجاہت پر وہ پہلے ہی دن مر مٹی تھی۔اب بیوی

اور تین بچوں کے لئے شہر کے بازار میں پکوڑی کی مشین لگائے دن بھر محنت کر کے جب وہ بسوں میں لٹک کر گھر پہنچتا تو تھکان اور پسینے سے بے حال ہوتا۔ گھر میں موجود نپے تلے پانی سے بالٹی بہا کر وہ جسم ٹھنڈا کر لے یا اگلی صبح تک ضروری کام نمٹا لئے جائیں جس میں بیت الخلا کے لئے بھی پانی کی ضرورت شامل تھی۔ ایسے میں ہر روز اس میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ پانی کا کین بھرنے گھر سے دور لگے نلکے تک جائے جو کسی دردمند نے گھر کے باہر لگا رکھا تھا۔ آج کی خوشبو کیسی تھی کہ وہ فیصل کے لئے سوچتی اندر تک کڑوی ہو گئی تھی۔

''مہنگائی بہت ہے۔ اگر فی فرد دس دس ہزار بھی دے تو ایک سو بیس افراد چاہئیں اس جنریٹر کی خریداری کے لئے'' سمیع صاحب کہہ رہے تھے۔

دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی وہ برتنوں سے فارغ ہو کر کچن سے پلٹ رہی تھی کہ اس کے کانوں میں یہ آخری جملہ پڑا وہ اخبار پھیلائے اسی اشتہار پر نظریں جمائے تھے۔

دس ہزار فی آدمی ...... اُف! میں تو بس یہ سو روپے ہی دے سکتی ہوں جو آج دہی خریدنے کے لئے رکھے تھے۔ چھوٹا کب سے لسی کی فرمائش کر رہا ہے سوچا تھا آج اس کے لئے لسی بنا ہی دونگی۔ گرمی بہت ہے پیٹ کو ٹھنڈا کر دے گی۔ فیصل کو تو اب کسی چیز کا شوق ہی نہیں آتا۔ چلو لسی چھوڑو، دس روپے کی برف کوٹ کر باجی کے دیئے ہوئے شربت کی بوتل سے گولہ گنڈا بنا دونگی چھوٹے کو وہ اس سے بھی خوش ہو جائے گا'' دل ہی دل میں وہ سوچتی دوپٹے کے پلّو سے پیسے کھولتی ہوئی سمیع اور بیگم سمیع کے پاس پہنچ گئی۔

''باجی! جی یہ میری طرف سے ہسپتال میں دے دیجئے گا۔ کیا پتہ اس کے صدقے میرے بچوں کی اور میری زندگی بھی آسان ہو جائے۔'' اس نے اشتہار کی طرف اشارہ کیا اور سو روپے کا کئی تہوں کے ساتھ مڑا نوٹ ان کے سامنے میز پر رکھ کر باہر چلی گئی۔

بیگم بلقیس سمیع نے ششدر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جس لمحے مڑا ہوا نوٹ ہاتھ میں تھاما، وہ انہیں ان کھجوروں کی طرح لگا جنہیں غزوہ تبوک کے موقع پر آنحضرتؐ نے مال کے ڈھیر پر پھیلا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نوٹ بھی ہر لحظہ اپنی قیمت بڑھاتا طاقتور ہوتا جا رہا ہو......اور طاقتور!

۞۞۞

عالیہ حمید

سوتیلے پن کی چھاؤں

''مومنہ!''اس نے تقریباً چلاتے ہوئے بہن کو آواز دی تھی۔

''ہاں،آں''اس نے گیلری سے ہی پر زور آواز میں جواب دیا۔

''ذرا اندر آنے کی زحمت کریں گی آپ؟''اس نے پھر سے کوشش کی کہ مومنہ اندر آ کر اسے غباروں کا پیکٹ پکڑا دے تا کہ اسے میز سے نیچے نہ ہی اترنا پڑے۔

''جی فرمائیں'' مومنہ ہاتھ میں جھاڑنے والا کپڑا پکڑے دروازے سے جھانکی۔

''مومنہ جلدی کرو،مجھے یہ غبارے پکڑاؤ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے،اور تم ہو کہ بات ہی نہیں سن رہی ہو۔امی بازار سے آتی ہی ہونگی۔''

''فکر نہ کرو۔ماما بازار گئی ہیں تو شام سے پہلے نہیں لوٹیں گی۔احمد بھی تو انکے ساتھ ہے۔ہزار چیزیں تو اس کو یاد آئیں گی......!'' مومنہ نے فرش پر گرا غباروں کا پیکٹ ایمان کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اوں ہوں......آج واپسی جلدی ہو گی عصر تو ہونے والی ہے۔عام روٹین میں بازار نہیں گئی ہیں وہ......اچانک ایمرجنسی جانا ہوا ہے کچھ ضروری شاپنگ کریں گی اور واپس۔احمد اس لئے ساتھ گیا ہے کیونکہ ڈرائیور چھٹی پر تھا وہ ہزار کیا لاکھوں چیزیں یاد کرے لیکن آج اس کی چیزیں کم ہی خریدی جائیں گی۔آج بابا کا دن ہے......صرف بابا کا دن!''ایمان نے پیکٹ میں سے غبارہ نکالتے ہوئے محبت بھری آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں......ہاں......یہ تو ہے!آج صرف بابا کا دن ہے اور بابا کو میرے خیال سے آئیڈیا نہیں ہوگا اس سب کچھ کا جو ہم ان کے اعزاز اور خوشی کے لئے کر رہے ہیں۔وہ شام کو لوٹیں گے تو اچانک یہ سب دیکھ کر بے انتہا خوش ہوں گے۔''مومنہ نے سر اوپر اٹھا کر ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔بہت خوش ہونگے۔یہ کوئی سالگرہ تو ہے نہیں جس میں رشتہ داروں اور دوستوں اور محلے والوں کو بلایا جائے گا۔اس پر رونق تقریب میں بابا،ماما،احمد،میں اور تم......صرف ہم شریک ہونگے اور بالکل ذاتی قسم کی ہوگی۔دوستوں وغیرہ کو بابا بعد میں خود deal کر لیں گے اور اب تم جاؤ جلدی سے باقی کی صفائی اور سجاوٹ مکمل کرو۔ماما کے آنے تک یہ کام تو ہو جائے ناں!نہیں تو ہمیشہ کی طرح سخت سست کا طعنہ سننا پڑے گا''۔

ایمان نے غبارہ ہوا سے بھر کر دھاگہ لپیٹتے ہوئے کہا وہ تقریب کی تیاری کے سلسلے میں لاؤنج کے چھت پر لگے پنکھے غبارے اور دیگر سجاوٹ کی چیزیں لگا رہی تھی جبکہ مومنہ کام والی

کے ساتھ باقی گھر کی صفائی دیکھ رہی تھی اور کہیں کہیں خود بھی کر دیتی تھی۔ عصر کے کچھ دیر بعد ہی ماما اور احمد بھی لوٹ آئے۔ کچھ دیر آرام کے بعد انہوں نے سب کی کہی ہوئی چیزیں انکے حوالے کیں۔ یہ زیادہ تر گفٹس تھے جو بچوں نے بابا کے لئے منگوائے تھے۔ پکوان کی تیاری کے لئے کام والی کو خصوصی ہدایات دیں۔ گوشت اور پھل اس کے حوالے کیا اور خود موبائل سے اپنے شوہر کا نمبر ملایا۔

''خیریت ہے'' اُدھر سے آواز آئی۔

''ہاں۔ بالکل خیریت ہے میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آج آپ جلدی گھر آجائیں تو کتنا اچھا ہو، بچوں کی بھی یہی خواہش ہے۔'' انہوں نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو سب کے سب منہ پر انگلی رکھے ماما کو مزید کچھ بولنے سے منع کر رہے تھے۔

''کیوں بھئی۔ آج کوئی خاص بات ہے کیا'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے سب جانتے ہوں۔

''بس آپ آئیں تو، پھر دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''چلو ٹھیک ہے کوشش کر سکتا ہوں سو وہ کرلوں گا۔ اللہ حافظ'' اور کال ختم ہوگئی۔

لیکن ہوا یہ کہ بابا جس وقت عام دنوں میں گھر آتے تھے وہ اس وقت بھی نہ پہنچے انتظار، انتظار، خفگی، بے چینی۔ بچے تھک گئے تھے اور ناراض بھی ہو رہے تھے۔ ماما ان کو تسلیاں دے رہی تھیں۔

''کلینک میں کام ہوگا بیٹا گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ ڈاکٹر ہیں ان کا کام ہی ایسا ہے۔ کوئی مریض آگیا ہوگا۔ ایمر جنسی کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔''

''اور بھی ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ بے شمار نرسز ہوتی ہیں۔ آج بروقت آجاتے تو کیا ہو جاتا'' احمد نے قدرے ناراضگی کے ساتھ کہا۔

''وہ مسیحا ہیں اور پھر ان کی تسلی بھی تو نہیں ہوتی۔ بیٹا ڈاکٹر لوگوں کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا ہسپتال میں ان کو گھر بھول جاتا ہے'' ماما نے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''ماما آپ ایک دفع فون تو کریں اگر وہ زیادہ مصروف ہیں تو ہم یہ تقریب کل کرلیں گے'' مومنہ نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے'' ایمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے موبائل ماما کو پکڑا دیا۔

''نہیں اٹھا رہے!'' کافی دیر موبائل کان کے ساتھ لگانے کے بعد ماما نے کہا۔ ''ذرا ptcl سے کر کے دیکھتی ہوں۔'' انہوں نے فون سیٹ سے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!'' ادھر سے کسی نرس نے اٹھایا تھا غالباً، نسوانی آواز تھی۔

''جی مجھے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا تھی میں ان کی مسز بات کر رہی ہوں۔''

''جی۔ ڈاکٹر صاحب تو آج ظہر کے وقت چھٹی لیکر گھر چلے گئے تھے'' نرس نے نرمی سے جواب دیا۔ کچھ دیر تو وہ حیرت سے ساکت ہوگئیں پھر خاموشی سے فون بند کر دیا نرس کے ساتھ مزید سوال جواب کا فائدہ نہیں تھا۔

''ظہر کے وقت چھٹی! اور میری بات عصر کے بعد ہوئی ہے۔ آدھ گھنٹے کی مسافت پر ہسپتال ہے گھر نہیں آئے، موبائل

پر ذکر بھی نہیں کیا انہوں نے۔ تو پھر پہنچے کیوں نہیں...... کہاں گئے؟'' وہ سرگوشی میں بات کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆......☆

لکڑی کے گہرے فاختہ رنگ دروازے کے آگے چھوٹا سا صحن اور سامنے برآمدے میں دو کمروں پر مشتمل مختصر سے گھر میں آج کچھ رونق تھی۔ صحن کے ایک طرف دیوار کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے سیمنٹ پر مشتمل یہ سیڑھیاں کچی مٹی کے بنی چھت پر کھلتی تھیں۔ جس کے گرد کوئی جنگلہ نہ تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے خالی جگہ میں کاٹھ کباڑ اور دیگر استعمال کی اشیاء بکھری پڑی تھیں۔ ساتھ ہی چبوترہ تھا جس کے اندر مٹی کا بنا چولہا اور کچھ کچن کی دیگر ضروری اشیا مثلاً توا، چمچہ، پیالیاں وغیرہ ہر وقت پڑے رہتے تھے۔

دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ بغیر چھت کے غسلخانہ اور اس کے آگے دروازے کی بجائے کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ دو چار چار پائیاں کچھ چوکیاں بھی تھیں۔ گھر کی ہر چیز پر گرد نمایاں تھی ۔لیکن کچھ سال پہلے ایسا نہ تھا جب اس گھر کی مالکن یہاں موجود تھی۔ اس وقت مختصر سے گھر میں صفائی تو نمایاں چیز تھی۔ باقی گزارہ صبر وشکر کے ساتھ ہو رہا تھا کہ وہ چار چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی۔

یہ وقت فضل احمد کے لئے انتہائی کڑا تھا۔ گھر میں دیگر رشتہ کی خواتین کب تک رہتیں۔ کچھ عرصہ تو وقت گزرا پھر سب رشتہ دار خواتین بحالتِ مجبوری اپنے اپنے گھروں اور ذمہ داریوں میں پڑ گئیں اور فضل احمد کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ وہ فوج کے ریٹائرڈ صوبیدار تھے اور پنشن پر گزارہ چل رہا تھا۔ گھر میں بچوں کی روز کی ضرورتیں شرارتیں اور گھریلو امور کو سنبھالنا ان کے بس کی بات نہ رہی۔ دو بیٹیاں تھیں جو ابھی بہت چھوٹی تھیں ایک دس سال دوسری گیارہ سال کی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹوٹی پھوٹی صفائی کرتیں۔ کھانا پکانے کی بھی کوشش کرتیں لیکن ان گھریلو امور کے لئے کسی سمجھدار خاتون کی ضرورت تھی۔ بیٹا سب سے بڑا 13 سال کا تھا اور اس سے چھوٹا 12 سال کا۔ اوپر تلے چار بچوں کی پیدائش کے بعد گھر کی مالکن صحت کے اعتبار سے کمزور ہوتی گئی اور ان معصوم کلیوں کو چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

فضل احمد کی بیٹیوں روبینہ اور یاسمین کو اس چھوٹی عمر میں گھر کی تمام ذمہ داریاں حوالے کرنا بہت مشکل تھا۔ بن ماں کے بچوں کو ماں کی ضرورت تھی جو انہیں کھلائے ، پلائے ، نہلائے اور پہنائے۔ تبھی فضل احمد نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا اور گہرے فاختہ رنگ کے دروازوں اور کھڑکیوں پر مشتمل اس مختصر سے گھر میں آج رونق تھی ۔ بچے اور دیگر رشتہ دار خواتین صحن میں ادھر اُدھر اپنے کاموں میں مگن تھے۔ دلہن گھر آ چکی تھی۔ محلے بھر کی بچیاں کمرے میں جھانک جھانک کر دیکھتی تھیں۔

دلہن حمیدہ بیگم کھلے پائنچوں کی سرخ شلوار اور سنہری گوٹا لگی لمبی قمیض پہنے اوپر اسی رنگ کا گوٹا لگا دوپٹہ اوڑھے سر جھکائے گول گھڑی بنی چار پائی پر خاموشی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ حمیدہ بیگم کے والد ایک نیک سیرت انسان تھے اور والدہ راضی برضا انتہائی صابر خاتون تھیں۔ حمیدہ سب بہنوں بھائیوں میں چھوٹی تھیں ۔ تمام بہن بھائی بیاہے جا چکے تھے اور ان کی

اولادیں حمیدہ بیگم سے عمر میں زیادہ چھوٹی نہیں تھیں۔ وہ آپس میں دوستوں کی طرح کھیلا کرتے اور حمیدہ اپنی بھانجیوں کے ساتھ سکول بھی جاتی تھیں شادی کے وقت ان کی عمر 35 برس تھی۔ ''اچھے رشتہ'' کی تلاش میں وہ اس عمر کو پہنچیں لیکن مقدر کے اپنے کھیل ہوتے ہیں۔ ان کو 36 برس کی عمر میں فضل احمد کی دوسری بیوی بننا تھا اور وہ بن کر آ گئیں بلکہ فضل احمد جا کر انہیں لے آئے۔

''دیکھو حمیدہ! گھر مختصر سا ہے۔ لیکن ہے روکھا سوکھا جو کھلا سکوں گا کھلاؤں گا۔ میرے پاس جو کچھ ہے مال و متاع، یہ گھر۔ اگرچہ بہت تھوڑا ہے لیکن آج سے سب تمہارا ہے تم اس گھر کی مالکن ہو میں آنکھیں بند کئے سب تمہارے حوالے کئے دیتا ہوں۔ لیکن مجھے ایک کھٹکا سا ہے ''سوتیلا پن'' زمانے میں بہت داغدار ہو چکا ہے۔ یہ بن ماں کے بچے بھی آج تمہارے ہیں تمہارے خاندانی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں امید کر سکتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ وہ روایتی سلوک کبھی نہیں کرو گی......!'' فضل احمد چار پائی پر اس کے سامنے بیٹھے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

حمیدہ بیگم سر جھکائے سب سن رہی تھیں۔

پھر وہ اٹھے اور باہر صحن میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو انکے ساتھ چاروں بچے تھے

''یہ اشفاق احمد ہے ان کا سب سے بڑھا بھائی بیٹا سلام کرو۔ یہ تمہاری امی ہیں'' فضل احمد نے اشفاق کو کندھے سے پکڑ کر پیار سے کہا۔

''جی۔ السلام علیکم باجی!'' اشفاق نے معصومیت سے کہا۔

اس گھر میں آنے کے بعد حمیدہ بیگم پہلی بار سر اٹھا کر ذرا سا مسکرائی تھیں۔ اشفاق کے باجی کہنے پر انہیں ہنسی آ گئی تھی۔ انہوں نے منہ سے کچھ بولا نہیں بس پیار سے ہاتھ اس کے کندھے پر پھیرا۔

''باجی نہیں، امی! اور یہ مشتاق احمد ہے اس سے چھوٹا ''، فضل احمد نے دوسرے بیٹے کو آگے کیا۔ جی السلام علیکم باجی!''

مشتاق ہمیشہ اشفاق کی تقلید کرنے والا تھا۔

حمیدہ بیگم نے اس کو بھی تھپتھپایا تھا۔

''یہ روبینہ اور یہ یاسمین!'' انہوں نے دونوں کو بیک وقت آگے کیا۔

''السلام علیکم باجی!'' دونوں کو کہنے کی ضرورت نہ پڑی اب کے حمیدہ نے بھی دونوں کو بیک وقت آگے کیا اور یاسمین کو دائیں جبکہ روبینہ کو بائیں گال پر بوسہ دیا۔

☆......☆......☆......☆

حمیدہ بیگم نے جلد ہی گھر کا نظام سنبھال کر اپنے سگھڑ ہونے کا بھرپور اظہار کر دیا۔ گھر کی گرد بھی اتر گئی اور بچوں کو ماں بھی مل گئی۔ جی ہاں بالکل حقیقی ماں! اس نے کبھی منہ سے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ عملی ثبوت پیش کئے۔ اردگرد کے لوگوں نے اسے بہکانے کی کوشش کی لیکن اپنی ماں کی نصیحت پلے باندھے رکھی اس نے۔

''گھر بھی تمہارا ہے اور بچے غیر نہیں ہیں ان کو ماں بن کر دکھاؤ پھر دیکھنا سوتیلی اولاد تمہاری اپنی اولاد سے بڑھ کر خدمت گزار اور وفا شعار ہو گی لیکن اس پھل کو پانے کے لئے

تمہیں صبر جیسے کڑے امتحان سے گزرنا ہوگا!''

اس گھر میں حمیدہ بیگم نے جلد ہی سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

''اوئے اوئے...... بھائی ذرا آہستہ۔کوئی آندھی تو چل نہیں رہی جوتم یوں ہلکے پتوں کی طرح لرز رہے ہو''مشتاق نے بڑے بھائی اشفاق کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے کہا جو برآمدے میں چوکی پر بیٹھا انگلش کا سبق دہرا رہا تھا اور مخصوص انداز میں ہل رہا تھا۔

''چلو بھاگو پڑھنے دو مجھے''اس نے کہا اور پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔

''مشتاق! چلو تم بھی بستہ لے آؤ اور سبق یاد کرو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اشفاق کی طرح دل لگا کر نہیں پڑھتے ہو۔'' حمیدہ بیگم نے نرمی سے کہا وہ صحن میں چولہے کے پاس بیٹھی ہنڈیا بھون رہی تھیں۔

''ناں۔ باجی ناں! یہی کافی ہے ایک پڑھا کو...... میں نے پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ کیا زندگی ہوئی، ہر وقت کتابوں میں منہ دے کر بیٹھے رہو بندہ گلی محلے میں گھومے کوئی دوست دوست پالے کل کلاں کو کام آئیں۔ نہ اس کا کوئی ڈھنگ کا دوست ہے اور نہ اسے کریانے کی دکان کا راستہ معلوم ہے۔'' مشتاق نے تو حمیدہ بیگم کو لاجواب کر دیا۔

''تمہیں ماسٹر کچھ نہیں کہتے؟ نہ کام کرتے ہو گھر کا نہ سبق یاد کرتے ہو''حمیدہ بیگم نے ہنڈیا میں پانی کے چند چھینٹے دیتے ہوئے کہا۔

''لحاظ کرتے ہیں میرا اس کی وجہ سے۔ ہی، ہی ہی ہی ......اکثر کہتے ہیں ماسٹر صاحب کہ جی چاہتا ہے مار مار کر تمہیں ،الو بنا دوں مگر اشفاق کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں میرا پوزیشن ہولڈر طالب علم ہے۔اس کے بھائی کو مار پڑے تو اس کی بے عزتی ہے۔ان کا بھی اپنا اصول ہے۔''مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور باجی۔ یہ اصولوں کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ سمجھائیں اس کو''اب کے اشفاق بولا۔

''ہاں بیٹا تمہارا نالائق ہونا بھی تو اس کی بے عزتی ہے۔''حمیدہ بیگم نے ہنڈیا میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔

''میں لائق ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔دونوں بھائی لائق ہو گئے تو نظر لگ جائے گی۔اس کا بھی بیڑہ ڈبو دوں گا۔''اس نے کہا اور بیٹ بال اٹھا کر باہر نکل گیا۔

''جلدی واپس آنا نظر بٹو......ابا کے آنے سے پہلے!'' حمیدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆......☆

اس گھر میں حمیدہ بیگم کو معاشی بدحالی کا مسئلہ تھا۔پنشن اتنی ہی تھی کہ جس سے مہینے کے پندرہ بیس دن تو چولہا آسانی سے چلتا رہتا باقی کے دنوں میں کھینچ تان کر گزارہ ہوتا۔اوپر سے بچے سبھی سکول جاتے تھے، ان کی فیس کتابیں کاپیاں، یونیفارم، پھر گھر کے دیگر ضروری اخراجات۔انہوں نے کبھی شکایت تو نہیں کی لیکن معصوم بچوں کی خاموش آنکھیں بہت کچھ بولا کرتی تھیں اور پھر فضل احمد کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ بیٹوں کو میٹرک کروا کر کسی کام پر لگا دیں اور بیٹیاں گھر کے امور میں ماں کا ہاتھ بٹائیں۔

''ابھی جانے دیں ان کو سکول اب لوگ پڑھاتے ہیں بیٹیوں کو بھی۔ ذراسی تو فیس ہے ان کی۔ آپ خوامخواہ گھبرا گئے ہیں......کم ازکم میٹرک تو کرنے دیں ان کو'' حمیدہ بیگم چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھی انکے پاؤں دبارہی تھیں۔

''پڑھ لکھ کر کونسا نوکری کرنی ہے۔کل کو چولہا ہی سنبھالنا ہے کچھ اخراجات بھی کم ہو جائیں گے۔'' فضل احمد صاحب نے بڑا روایتی سا جواب دیا تھا۔

''اخراجات کی فکر آپ نہ کریں یہ سب خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ بہتر کرے گا۔'' حمیدہ بیگم نے تسلی دی۔

''باقی بچے تو شاید کوئی اعتراض نہ کریں لیکن اشفاق کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔اس کی فکر لگی ہے مجھے۔کسی امیر کبیر باپ کے گھر میں پیدا ہوتا......تو......!''

''تو کیا؟ تو ہوسکتا ہے وہ پڑھنے کا شوقین ہی نہیں ہوتا۔ آپ کے گھر میں پیدا ہوا ہے، پڑھے گا بھی اور ڈاکٹر بھی بنے گا ......خدا بنائے گا! اس طرح کی فکریں انسانوں کے کرنے کی نہیں......یہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو اسی کے ہاتھ میں رہنے دیں'' حمیدہ نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''بہت صابر ہو تم...... بڑا تو کلّ سکھایا ہے تمہارے ماں باپ نے تمہیں! تمہاری وجہ سے میری اجڑی ہوئی دنیا پھر سے آباد ہوگئی۔نصیبوں والوں کو ملتی ہیں ایسی بیویاں اور ایسی سوتیلی مائیں۔'' وہ حمیدہ بیگم کی تعریف بھی کررہے تھے اور انہیں چھیڑ بھی رہے تھے۔

''جانے دیں، آرام کریں اب آپ!'' وہ ذرا شرماتے ہوئے اٹھیں اور باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆......☆

یہ بریک فضل احمد صاحب کی زندگی میں بعد میں بھی کئی بار آیا، جب وہ سوچتے کہ اخراجات کا مسئلہ ہے کیوں نہ بچوں کو تعلیم چھڑوا کر کام پر لگوا دیں۔بچیوں کو گھر بٹھا دیں لیکن حمیدہ بیگم نے انہیں سمجھا بجھا کر ''زندگی کی گاڑی جیسی چل رہی ہے ویسی چلنے دیں'' پر راضی کرلیا۔اس دوران وہ خود دو عدد بچوں کی ماں بن چکی تھیں، انیسہ اور ارسلان، لیکن ماں کی نصیحت پلے سے باندھے رکھی اور بچوں کی ضرورتوں میں فرق روا نہیں رکھا۔

''السلام علیکم''......!ابا جی کیا حال ہیں۔'' مشتاق نے اونچی آواز میں پکارا۔''ٹھیک بالکل'' وہ حیرت سے اس کے بدلے ہوئے انداز کو دیکھ رہی تھیں روبینہ اور یاسمین بھی اپنے اپنے کام چھوڑ اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کدھر ہے وہ پڑھاکو'' مشتاق نے کہا۔

''ابھی گھر نہیں آیا۔سناؤ کیسا رہا رزلٹ؟'' حمیدہ بیگم نے سبزی بناتے ہوئے کہا۔

''وہ پڑھاکو تو ٹاپ کر گیا۔بڑی عزت افزائی ہوئی میری بھی۔سب نے مبارکیں دیں مجھے، ابا جی کدھر ہیں۔پتہ چلا انہیں؟'' مشتاق خوشی سے سرشار تھا۔

''ہائے بھائی خدا کا شکر ہے میں نے تو بھائی کے لئے منت مانی تھی'' روبینہ نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اور تمہارا کیسا رہا'' یاسمین نے پوچھا۔

''او چھوڑ جی رہنے دو......'' جاؤ کھانا لاؤ مشتاق نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وقت سے پہلے ہی بھوک لگ گئی ؟'' حمیدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جبکہ یہ اس کی بھوک اڑ جانے کا دن تھا'' یہ فضل احمد صاحب تھے۔سب نے مڑ کر دروازے پر دیکھا۔وہ ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ پکڑے کھڑے تھے۔

''اشفاق نے میٹرک میں ٹاپ کیا ہے بھوک کیوں اڑتی ؟ ابا جی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں یہ تو خوشی کا دن ہے آپ کو بھی مبارک !''

''چل رہنے دے بس کر! تجھ سے یہی امید تھی مجھے'' انہوں نے ڈبہ حمیدہ بیگم کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''بانٹ دینا محلے میں'' اور خود خاموشی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''آج بہت خوشی کا دن ہے! مجھے تو بے انتہا فخر محسوس ہو رہا ہے۔آج اگر اس کی سگی ماں زندہ ہوتی تو کس قدر ناز کرتی۔پاؤں زمین پر نہ ٹکتے اس کے......لیکن خیر کوئی بات نہیں۔وہ آسمانوں سے یہ دن دیکھتی ہوگی'' حمیدہ بیگم نے آہستگی سے کہا۔جیسے وہ فضل احمد صاحب کی خاموشی کو سمجھتی ہوں۔

''ہاں لیکن مجھے اس مقام پر پہنچانے میں آپ کی ہمت بھی شامل تھی۔اس لئے آپ ہی ناز کریں اور آپ ہی فخر کرنے کا حق بھی رکھتی ہیں'' یہ اشفاق کی سنجیدہ اور بارعب آواز تھی۔

اب کے حمیدہ بیگم کچھ نہیں بولیں۔آنسو آنکھوں میں لئے سبزی کاٹتی رہیں۔فضل احمد صاحب ارسلان کو گود میں لے کر بہلانے لگے۔روبینہ نے اپنے آنسو پی لئے تھے اور یاسمین بھی اس کوشش میں تھی۔

''بھرا جی! آگے کیا ارادہ ہے؟'' مشتاق نے ماحول کی سنجیدگی توڑنے کی کوشش کی۔

''آگے تم دونوں کو کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کروادوں گا۔اب تم لوگ میرا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئے ہو'' اشفاق کی بجائے فضل احمد صاحب نے جواب دیا۔

حمیدہ بیگم نے نگاہیں اٹھا کر اشفاق کی طرف دیکھا۔وہاں چہرے پر زردی نمایاں ہو رہی تھی اور آنکھوں میں سمائے خواب بکھرتے دکھائی دیتے تھے۔

''مشتاق اگر چاہتا ہے کہ نہ پڑھے تو اسے کام پر لگوا دیں لیکن اشفاق نے تو اتنے اچھے نمبر لئے ہیں اسے پڑھنے دیں'' حمیدہ بیگم نے ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی میرا ابھی یہی خیال ہے'' مشتاق نے تائید کی۔

''پڑھ کر کیا کرو گے، پھر بھی تو دکان پر بیٹھنا ہے ناں......بہتر ہے ابھی سے بیٹھ رہو'' انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا۔چاہتے تو وہ بھی تھے کہ بیٹا پڑھے لیکن انہیں اپنے حالات کو بھی دیکھنا تھا۔

''ڈاکٹر بنے گا پڑھ کر اور ڈاکٹر دکان پر نہیں ہسپتال میں بیٹھتے ہیں'' حمیدہ بیگم نے کہا۔

''ہوں تو ڈاکٹر بنے گا یہ! خرچہ کہاں سے کریں گے تمہارا ؟'' انہوں نے حمیدہ کی بجائے اشفاق کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ابو جی ایک دفعہ میں پڑھ گیا تو پھر ہماری تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی۔میں ساتھ ساتھ بچوں کو ٹیوشن وغیرہ پڑھا کر اپنی فیس پوری کروں گا'' اشفاق نے امید بھرے لہجے میں

کہا۔

''ابھی کچھ رقم دیں تاکہ داخلہ وغیرہ کرواسکوں پھر بعد میں ٹیوشن کا سلسلہ شروع کروں گا۔'' اشفاق نے ابو جی کو خاموش پاکر سمجھا کہ وہ مزید پڑھانے پر راضی ہیں۔

بیٹا تقاضہ کر رہا تھا اور وہ بہت بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ مہینہ کا آخر تھا اور پنشن ساری حمیدہ بیگم کو تھما دی تھی جس میں سے چند نوٹ ہی باقی ہوں گے اس کے پاس۔ تو اشفاق کو کہاں سے دیں فیس کے پیسے...... اور پھر سائنس کی تعلیم تھی، آرٹس کی نسبت ذرا مہنگی۔ قرض لینا ان کی خودداری کے خلاف تھا اور قرض کب تک لیتے رہتے۔ اشفاق تو ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ یعنی ایک لمبا سلسلہ چل نکلتا۔ لہٰذا ان کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''بیٹا تم تیاری کرو فیس کے مسئلے بھی حل ہوتے رہیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہے جس کے لئے تم ٹیوشن پڑھاؤ گے۔ تم داخلہ لو اور پڑھائی پر توجہ دو بس'' حمیدہ بیگم نے سبزی کی ٹوکری اٹھا کر صحن میں چبوترے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہاں سبزی رکھ کر اندر چلی گئیں۔

''چلو اگر تمہیں پڑھنے کا شوق ہے تو آرٹس کے مضامین لے کر کچھ سال شوق پورا کرلو۔ پھر بھائی کے ساتھ کام پر لگ جانا'' فضل احمد صاحب اس کے سوا اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے ہی نہیں!

''پڑھنے کا شوق ہے تو میڈیکل ہی پڑھنے دیں ناں'' حمیدہ بیگم نے صحن میں آتے ہوئے کہا۔

''لو بیٹا یہ کچھ پیسے رکھ لو اور داخلے کا بندو بست کرو'' انہوں نے اشفاق کے ہاتھ میں کچھ رقم تھما دی۔ اشفاق نے مٹھی کھول کر دیکھا یہ ہزار ہزار کے چار یا پانچ نوٹ تھے۔ اور یہ تو بہت تھے۔

''شاید انہوں نے اپنی جمع پونجی مجھے تھما دی ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اتنی رقم ...... یہ کہاں سے آئی ؟'' فضل احمد صاحب نے حیرت کے مارے پوچھا۔

''آپ کی ہی حلال کی کمائی سے ...... فکر نہ کریں'' وہ چولہے پر ہنڈیا چڑھاتے ہوئے بولیں۔

''پھر بھی تم نے اس قدر رقم کیسے اکٹھی کر لی؟ اخراجات اس قدر اور یہ بچت...... یہ تو حیران کن ہے کوئی جادو وادو تو نہیں کیا؟'' انہوں نے اصرار کر کے پوچھنا چاہا۔

''اب جانے بھی دیں...... کچھ رقم کمیٹی ڈال کر اکٹھی کی اور کچھ خود تھوڑی تھوڑی بہت بچا کر رکھی تھی۔ اشفاق تم جاؤ بھی داخلے کا کچھ بندو بست کرلو'' انہوں نے پیاز ہنڈیا میں ڈالے۔

''لیکن باجی جی یہ تو بہت زیادہ ہیں ......'' اس نے چبوترے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''زیادہ؟ داخلہ ...... پھر کتابیں کاپیاں وغیرہ ...... یونیفارم...... ان سب پر پیسے نہیں لگیں گے کیا؟'' انہوں نے شفقت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

یوں اشفاق نے ایف ایس سی میں ایڈمیشن لیا۔ مشتاق کو ابا جی نے قرض پر رقم لے کر دوکان کھول دی تھی۔ دکان چلتی تھی لیکن کھانے والوں میں دو کا مزید اضافہ ہوگیا۔ کامران اور نفسیہ ! خدا کی قدرت کہ فضل احمد صاحب کو پہلی بیوی سے بھی دو بیٹے

اور دو بیٹیاں اور دوسری سے بھی دو بیٹے، دو بیٹیاں ملیں۔

یوں اپنی پنشن اور دوکان سے آٹھ بچوں کی تربیت اور پرورش کا سلسلہ کافی مشکل چل رہا تھا۔

''باجی جی! ذرا یہ بٹن تو لگا دیجئے مجھے دیر ہو رہی ہے کالج کے لئے نکلنا ہے'' اشفاق نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عجلت میں کہا تھا۔

اس عجلت میں حمیدہ بیگم کمرے کی دیوار کے ساتھ بنی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی۔

''شام کو کیوں نہ بتایا؟ ابھی تو شاید دیر ہو ہی جائے تمہیں'' انہوں نے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔

''سوچا تھا بتاؤں پھر پڑھنے بیٹھ گیا تو دھیان نہیں رہا'' وہ انہیں پریشان دیکھ کر حیران ہو رہا تھا

''اچھا رکھو ذرا ہاتھ دھولوں'' حمیدہ بیگم نے ہاتھ دوپٹے کے نیچے کر رکھے تھے۔

''ایسی قیمتی بھی نہیں میری شرٹ......آپ انہی ہاتھوں سے بٹن لگا دیں'' اشفاق نے شرٹ انکے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔

''بھئی ذرا کلف لگ گئی تھی۔ دھونے تو پڑیں گے، میں ابھی آئی'' حمیدہ بیگم نے کہا اور باہر نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اشفاق نے دانستہ کمرے کی کھڑکی کھولی جو حمیدہ بیگم نے عجلت میں بند کی تھی۔ کھڑکی کے ایک خانے میں بہت سی کالی سیاہی کی پڑیاں رکھی تھیں اور ساتھ ایک برتن میں سیاہی کا پاؤڈر بھی تھا۔ اوپر والے خانے میں قلم اور سلیٹیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی ٹوکری میں کچھ رقم تھی۔ جلدی میں وہ گن نہیں سکا۔ دس دس کے کچھ نوٹ رکھتے تھے۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔

''لاؤ قمیض دو'' حمیدہ بیگم اندر آئیں تو ہاتھ میں سوئی دھاگہ بھی تھا۔ اشفاق کی قمیض کو بٹن لگاتے وقت انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کافی گھس چکی ہے اور بس پھٹنے ہی والی ہے۔ کچھ جگہوں سے سلائی کا دھاگہ بھی سر نکال چکا تھا۔ کف گھس کر پرانے ہو چکے تھے۔ کالروں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ یونیفارم اس نے فسٹ ایئر میں لیا تھا اور اب سکینڈ ائیر کے آخر میں تھا۔ اس کے پاس ان دو سالوں میں واحد یہ یونیفارم تھا جسے بار بار دھونے اور زیادہ استعمال نے خستہ حال کر دیا تھا۔ گھر میں پہننے کے لئے اشفاق کے پاس مناسب اور مکمل سوٹ کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ گھر آ کر یونیفارم نہایت احتیاط کے ساتھ اتار کر کھونٹی پر ٹانگتا۔ پھر گھر کے لئے رکھا ایک جوڑا پہن لیتا اور سارا وقت اس میں گزارتا اس نے کبھی کوئی مطالبہ یا تقاضا نہیں کیا۔ اسے کالج کی فیس مل جاتی تو وہ سمجھتا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی۔ اس لئے پھر اس کے بعد کسی چیز کا تقاضا کرنے کو گناہ سمجھتا تھا اور آج اس پر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ اس کی سوتیلی ماں حمیدہ بیگم جسے وہ سب بہن بھائی ''باجی جی کہا کرتے تھے، وہ سیاہیاں اور قلم بیچ کر اس کی فیس کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کر رہی تھیں!

''لو ہو گیا، دیکھو صحیح لگا ہے بٹن'' حمیدہ بیگم نے قمیض اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل صحیح، بہت شکریہ چلتا ہوں اللہ حافظ'' وہ ہونٹوں کو بھینچتا ہوا مختصر بات کر کے نکل گیا۔ (جاری ہے)

☆......☆......☆......☆

سعدیہ شفیق

اللہ کی میزبانی

اللہ رب العزت کا بے پناہ احسان ہے کہ اس نے 2009ء میں حج جیسے مقدس فریضے کی انجام دہی کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب کرے اور قبول بھی فرمائے (آمین)

ہوا کچھ یوں کہ 9 ذوالحجہ کو میدانِ عرفات میں خطبہ حج کے بعد ظہر وعصر کی نمازیں ادا کر کے مسجدِ نمرہ کی زیارت کے لئے گئے ۔ زیارت کے بعد بے پناہ رش میں دھکے کھاتے ہوئے ہم کافی دور نکل گئے ۔ میرے ساتھ میرے شوہر شفیق الرحمٰن تھے ۔ خطبہ سے قبل مسجد پہنچنے کے چکر میں ہم لوگ جو کھانے پینے کا سامان لیکر منیٰ سے چلے تھے، اسے خیمے میں ہی چھوڑ کر چل پڑے۔ اب جو تسلی ہوئی کہ حج کا اہم ترین رکن ادا کر چکے ہیں تو ایک دم سے بھوک اور پیاس کی شدت محسوس ہونے لگی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ خیمے دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے اور اردگرد بھی کوئی دکان یا سٹال وغیرہ نہ تھا کہ کچھ خرید کر کھا لیتے ۔ میری طبیعت بھوک اور پیاس کی وجہ سے بگڑنے لگی۔ شفیق صاحب بھی بہت پریشان کہ اب کیا کیا جائے جبکہ میرا بلڈ پریشر مسلسل لو ہوتا جا رہا تھا۔ شفیق صاحب بار بار تسلی دیتے کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں وہ یقیناً ہمارے لئے کوئی بہتر انتظام فرمائے گا۔ اپنے رب پر بھروسہ تو بہت تھا لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہو گئی۔ اچانک جب ہمت بالکل جواب دے گئی تو میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور اپنے رب سے بڑے مان سے کہا: ''یا اللہ ہمارے مہمان آئیں تو ہم سو چیزیں ان کے آگے رکھتے ہیں پر تیرے مہمان ہو کر ہم بھوکے پیاسے جا رہے ہیں ۔ میرے اللہ! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی!''

یہ سن کر شفیق صاحب نے مجھے ڈانٹ دیا کہ تم اللہ سے شکوہ کر رہی ہو۔ میں نے کہا، جس کے گھر آئے ہیں مہمان بن کر اسی سے مانگ رہی ہوں نا، یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے، وہ میری نیت اور مان کو جانتا ہے۔

خدائے مہربان کے قربان جاؤں وہ مناظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہیں اور بس آنسوؤں کی صورت میں اپنے رب کا شکرانہ ادا کر رہی ہوں ، کہ ابھی ہم چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک ٹرک ہمارے قریب آ کر رک گیا۔ جب ہم ذرا قریب پہنچے تو ایک آدمی نے ٹرک کا دروازہ کھول کر جوس ہماری طرف پھینک دیئے اور پھر دھڑا دھڑ جوس کے پیکٹوں کی بارش ہونے لگی، ہر طرف سے لوگ ٹرک کی طرف دوڑنے لگے۔ میں نے فوراً جوس پیا رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ ایک طرف سے ایک دس بارہ سالہ عرب بچہ لوگوں میں سیب بانٹتا آرہا تھا اس نے تین سیب ہمیں بھی پکڑا دیئے ۔ میں نے کہا

ہمیں دو ہی کافی ہیں تو بولا ''هٰذَا ضِيَافَةٌ مِنَ اللّٰهِ'' یہ اللہ کی طرف سے مہمان نوازی ہے۔ خوشی کے مارے آنسو نکل آئے پھر اپنے خیموں تک جاتے جاتے راستے میں ہم نے جوس اور پھل کے علاوہ بریانی، آئس کریم، زم زم کی بوتلیں، پیپسی کے ٹن، دہی اور لسی کے بند پیکٹ سب ہی کچھ اپنے رب کی مہمان نوازی سے پایا۔ اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے ہمارے پاس کھانے پینے کا اتنا سامان ہو چکا تھا کہ ہم نے مزدلفہ کے راستے میں خود لوگوں میں بانٹا الحمد للہ۔ یقین تو پہلے بھی تھا لیکن اب اور بھی پختہ ہو گیا کہ اگر ہم سچے دل سے اپنے رب کو پکاریں تو وہ ضرور سنتا بھی ہے اور جواب بھی دیتا ہے۔

''أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ''

میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جبکہ وہ مجھے پکارے۔ یہ میرے کچھ احساسات تھے جو میں دوسروں تک بہت دیر سے منتقل کرنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت نہ ہوتی تھی کہ پتا نہیں چھپے گا یا نہیں بہرحال اب میں نے ہمت کر کے لکھ دیا ہے ہاں ایک شعر حسبِ حال یاد آیا۔

نومیدیوں کے دشت میں جب بھی ہوئے ہیں گم
آئی ندائے لطف کہ تنہا نہیں ہو تم

☆☆☆

داستانِ عطاو بخشش

ڈاکٹر ثمین ذکا کے قلم سے روحانیت کے امتزاج کے ساتھ چند تحریریں قارئین بتول ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ''داستانِ عطاو بخشش'' میں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات سادہ اندازِ بیان میں تحریر کئے ہیں جو کئی پہلوؤں سے پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ انہیں قسط وار پیش کیا جارہا ہے (مدیرہ)

محترمہ ثمین ذکا ایک دردمند معالج، ایک باہمت ماں اور ایک خدا پرست انسان ہیں۔ ان کی شخصیت کی یقیناً اور بھی قابل قدر جہتیں ہوں گی جن سے مختلف لوگ آشنا ہوں گے۔ مگر میں نے جب بھی ان کو دیکھا، پارے کی طرح متحرک اور بے چین پایا۔ جیسے اندر ہر وقت کوئی لو جلتی رہتی ہو، کوئی لگن لگی رہتی ہو اور وہ بہت کم وقت میں بہت زیادہ کر لینا چاہتی ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ مجھے انسپائر کرتے ہیں۔ کئی بار دل چاہا ان کے اندر جھانک کر دیکھ سکوں وہاں کیا کچھ ہے۔ یہ آنکھوں میں جلتی لو کس دشت کی سیاحی کے سبب ہے۔ یہ گردِ مہ و سال کن راستوں، کن منزلوں کی مرہونِ منت ہے۔ مگر ہمیشہ ادب واحترام آڑے آیا اور زمانی ترتیب میں میرا خاصا بعد میں آنا اس بے تکلفی کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ اس کے باوجود یہ ان کی محبت وشفقت ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر دوستوں کی سی محفل کا لطف ملتا ہے، چھوٹا ہونے کے باوجود ''چھوٹے پن'' کا احساس نہیں ملتا۔

میری یہ خواہش کسی حد تک پوری ہوئی جب ''داستانِ عطاءو بخشش'' کا مسودہ میرے پاس آیا۔ اس کتاب کے لیے یہ حروف لکھنا میرے لیے اعزاز ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور تجربات کو انھوں نے اس طرح قلم بند کیا ہے کہ پڑھنے والے ان میں سے بہت کچھ اپنی دلچسپی کے مطابق اخذ کریں گے۔ مگر میرے لیے وہ ایک ایسی خاتون کے طور پر سامنے آئیں جنھوں نے اپنی خوش باش، مطمئن زندگی میں شدید آزمائش دیکھی۔ پھر آزمائش کے بعد اللہ پر توکل کرنا اور اس کے فیصلوں پر راضی برضا رہنا سیکھا۔ حساس دل ودماغ اور نازک اعصاب کی مالک خاتون نے کس طرح ٹوٹتی جڑتی ہمت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور ہارنے والوں میں شامل ہونا پسند نہ کیا۔ مگر سب سے اہم بات یہ کہ اس تمام سفر میں اپنے خالق کو پہچان کر اس سے ایسا اٹوٹ رشتہ جوڑ لیا جو ان کے لیے سب سے بڑا سرمایہ ثابت ہوا۔ مالک شاید آزمائشیں اسی لیے بھیجتا ہے۔ انسان کی فطرت میں رب کی پہچان تو ہے مگر خود انسان گھوم پھر کر، لمبا راستہ لے کر رب کی طرف آنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ ؎

تم آسانی سے مجھ کو مل نہ جانا
مجھے اپنا پتہ بھی ڈھونڈنا ہے

تو ان حالات نے ان کو عرفانِ ذات جیسی نعمت عطا کر دی۔ خدا سے تعلق نے زندگی کے بارے میں رویے کو مثبت رکھا اور اللہ سے اچھی امیدیں چراغوں کی طرح راستے کے اندھیروں میں جلتی رہیں۔

سکاٹ لینڈ کے شب و روز ان کی صالح فطرت اور راست فکر کے آئنہ دار ہیں۔ وہ یورپ جہاں جا کر اکثریت دیسی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، انھیں دین کی بات کے بغیر کہیں محفل سجانا اچھا نہیں لگتا۔ یہی راست فکری مشکلات میں ان کے کام آئی۔ پھر روحانی سفر کی ابتدا ہوتی ہے تو بنت الاسلام اور ام راشد جیسی ہستیوں کا ساتھ انھیں رہبانیت سے بچا کر عملی بنائے رکھتا ہے ورنہ کئی اس دشت میں آسانی سے سرابوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

خالق سے اسی تعلق نے ان کا تعلق مخلوق سے جوڑا اور پھر خدمت کے اس عظیم کام میں کیسے فرد سے قافلہ اور قطرے سے دریا بنا، اس کی تفاصیل ایمان افروز ہیں۔ لیکن یہاں بھی در پردہ ان کا اصل رنگ جھلکتا رہا۔ دوا دارو کرنا تو ان کا ظاہر تھا، مگر ان کے اندر کی اصل مسیحا مخلوق کو اس بہانے خالق سے جوڑتی نظر آتی ہے۔ گویا ؎

سیکھیں ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

وہ شاہدرہ کی بشیراں ہو یا گلاسکو کی مارگریٹ سمتھ، ان کا دل اصلی مسیحائی کے لیے مچلتا رہتا ہے، جو جسمانی بیماری و افلاس میں خزانوں کی کنجیوں جیسی ہے اور پیاسی روح کے لیے آبِ حیات جیسی!

مجھے امید ہے کہ یہ داستان پریشان خیالی اور آوارہ مزاجی کے اس دور میں ...... ڈپریشن، اینگزائٹی اور ہائپر ٹینشن کے اس زمانے میں کئی پڑھنے والوں کے راستے کو آسان کرے گی، حوصلوں کو جلا بخشے گی اور زندگی کے بارے میں مثبت سوچ کو پروان چڑھائے گی۔ ان شاء اللہ

صائمہ اسما

کہانی کا محرک!

اس روز صبح ہی سے گھر میں خوب رونق تھی۔ قریبی رشتہ دار خدا حافظ کہنے کو جمع تھے اویس بیٹا اپنی بیگم نوشین اور دونوں بچوں ضیاء اور غازی کے ساتھ چند ہفتوں کی چھٹیاں گذار کر واپس لندن جا رہے تھے۔

ان تھوڑے سے دنوں کا پتہ ہی نہ چلا۔ بچے کبھی ننھیال میں وقت گذارتے تھے اور کبھی دادی کے ہاں۔ خوشی اور رونق کا وقت بہت ہی جلدی گذرتا ہے اور اب صبح کے ساڑھے نو گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ سب سامان وغیرہ گاڑیوں میں رکھا جا چکا تھا۔ تو جانے والے سب کو مل کر اپنی نشستوں پر بیٹھے اور منزل کی طرف چل دیئے۔ تھوڑی دیر میں ہی سب عزیز بھی رخصت ہو گئے۔

بھائی جان طارق[1] تشریف فرما تھے ان سے مخاطب ہوئی اور کہا ''اب آپ کو بھی جانا ہو گا ضروری کام آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے'' وہ کہنے لگے ''میں کچھ دیر بیٹھتا ہوں''۔ ''کیا گلابی چائے پئیں گے؟'' ہاں ضرور' انہوں نے شوق سے کہا۔

[1] ائر کموڈور (ر) طارق مجید

بہت سی چائے تیار تھی مگر روانگی کی افراتفری میں کسی کو پوچھنے کی بھی فرصت نہ ملی۔

اچھا لگا کہ ایک مہمان تو ایسے ہیں جن کے ساتھ چائے پی جائے گی۔اسی دوران بھائی جان پوچھنے لگے گاؤں کے کام کیسے چل رہے ہیں؟ بس ان کا یہ پوچھنا تھا کہ میں نے شاہدرہ پروجیکٹ کی خاص خاص دلچسپ باتیں بتانی شروع کر دیں۔ چند ایک روحانی قسم کے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کے سچے واقعات بھی سنائے تو وہ آرام سے بولے ''یہ ایسی باتیں ہیں جو کہ لکھنی چاہئیں اس بارہ میں سوچنا''۔

پھر وہ تو اپنے گھر روانہ ہو گئے اور میرا ذہن اسی طرح کے بہت سے پرانے واقعات کو دہرانے لگا۔ جب کئی سال پہلے پاکستان بچوں کے ساتھ واپس آئی تھی پروفیسر ڈاکٹر نبیہ حسن[۲] کو ملنے گئی (ان سے خاصی واقفیت تھی ان کی بھتیجی ڈاکٹر صادقہ عباس میری بچپن کی سہیلی ہے) سالوں بعد ڈاکٹر نبیہ حسن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی چند باتیں ہوئیں بغور مجھے دیکھتی رہیں۔آخر میں کہا ''ثمین تیری زندگی کی فلم بہت تیزی سے چل گئی اور جو تبدیلیاں تمہارے اندر رونما ہوئی ہیں ان کے بارے میں کبھی ضرور لکھنا۔اس بات کو ذہن میں رکھنا'' تھوڑے وقفہ کے بعد زور دے کر کہا۔

ہر ماہ کے پہلے پیر کو ہمارے ٹرسٹ کی میٹنگ ہوتی ہے محترمہ ام راشد سے اُس روز اگلی میٹنگ کے بارے میں فون پر باتیں ہو رہی تھیں کہ کتاب والی بات یاد آ گئی ان سے ایسے ہی سرسری ذکر کیا تو جواباً بولیں ''میں تو کئی روز سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں کہوں اللہ کی مدد کے اتنے واقعات نظر آ رہے ہیں انہیں لکھنا چاہیے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے چند ایک واقعات مجھے فون پر ہی سنا دیئے۔محترمہ ام راشد ''دلو خورد'' کے پروجیکٹ کی ذمہ دار ہیں جبکہ شاہدرہ کی ذمہ داریاں زیادہ تر میرے اوپر ہیں ویسے بہت سی ذمہ دار ساتھی اللہ نے عطا کی ہوئی ہیں جو کہ ہر مرحلہ پر ساتھ دیتی ہیں۔

اب اس بات کو پورا ایک سال گذر چکا ہے اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ محرم اور 1431ھ کا سال ہے دسمبر 2009ء کا تیسرا ہفتہ ہے۔ لکھنے کا کام ذہن میں گھومتا رہا تھا مگر وہ یکسوئی حاصل نہ ہو رہی تھی پھر یہ بھی خیال آتا کہ یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد ذاتی شہرت یا نفس کی تسکین تو نہیں؟ مگر دل سے ہی جواب مل گیا کہ اس میں اللہ پر یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سا دلچسپی کا سامان ہو گا اور کچھ سبق آموز واقعات زندگی میں آسانیاں پیدا کر دیں گے۔

بس پھر اللہ رب العزت سے اس خصوصی کام کیلئے مدد مانگنے کی دعا نے مستقل دعاؤں میں مقام بنا لیا۔اب زندگی کی شام آ چکی ہے۔ لکھنے کی توفیق مل جائے گی تو یہ کٹھن منزل آسان ہو جائے گی۔

آغازِ سفرِ زندگی

ہماری والدہ صاحبہ کا تعلق بٹالہ سے اور والد صاحب لاہور سے تھے۔دونوں ہی ارائیں خاندان سے تھے۔

ارائیں لوگ اس خطہ کے باشندے نہیں ہیں وہ عراق سے صدیوں پہلے مبلغین کے ساتھ اس خطۂ ارضی میں آتے رہے۔

ہماری والدہ کی اماں چھوٹی عمر میں فوت ہو گئی تھیں۔ان کی بڑی ہمشیرہ کی شادی تیرہ سال کی عمر میں لاہور ہو چکی تھی۔ والدہ کا چھوٹا تین سال کا بھائی اور اس سے چھوٹی بہن ایک سال کی تھیں۔ان کی دادی نے تینوں کو بہت پیار اور سلیقہ سے پالا۔وہ خود بہت پکے ایمان والی تھیں۔پوتے پوتیوں کی بہت اچھی تربیت کی باتوں باتوں میں زندگی کے اصول قاعدے اپنے الفاظ میں بتایا کرتی تھیں۔والدہ تھوڑی بڑی ہوئیں تو

۲ سابق پرنسپل فاطمہ جناح میڈیکل کالج

امور خانہ داری میں دلچسپی پیدا کی۔ جب بھی کچھ فرصت ملتی تو پھوپھیوں کے ہاں سلائی کڑھائی کروشیہ وغیرہ سیکھنے بھیج دیتیں۔ دونوں پھوپھیاں رشتہ داروں میں بیاہی ہوئی تھیں اور ان کے گھر اسی محلّہ میں تھے۔ قرآن پاک نماز اور بنیادی دین کی تعلیمات بڑی پھوپھی سے ہی سیکھیں۔ ان کی دادی فارغ نہیں بیٹھنے دیتی تھیں اکثر اوقات یہ یاددھانی کراتیں ہاتھوں کو کارآمد کام میں، دل کو اللہ کی یاد میں مصروف رکھو گے تو اس دنیا اور اگلی دنیا میں بھی بھلا ہوگا۔

والدہ مرحومہ کی زندگی کے آخری سالوں میں اکثر میں ان کی طرف رہتی تھی اور وہ بہت شوق سے اپنے بچپن اور جوانی کے حالات وواقعات سنایا کرتی تھیں۔

والد صاحب کا خاندان صدیوں سے بھاٹی گیٹ میں رہائش پذیر تھا اور وہ سید علی ہجویریؒ کے بہت عقیدت مند تھے۔ بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا خاص طور پر انگلش لٹریچر بلکہ بے شمار کتابیں اکٹھی بھی کر رکھی تھیں۔

اس زمانہ میں علامہ محمد اقبالؒ نے بھاٹی کے بڑے بازار میں ایک بیٹھک کرایہ پر لے رکھی تھی جو کہ ہمارے دادا کے والد حاجی احمد بخش مرحوم کی تھی۔

والد صاحب کو علاّمہ محمد اقبال سے بے حد عقیدت تھی ان کے اشعار اکثر زبان پر رہتے۔ جب بی اے اچھے نمبروں سے کر لیا تو علاّمہ صاحب نے نوکری کا مشورہ دیا بلکہ بڑی تاکید کے ساتھ دفتر لاٹ صاحب (سول سکریٹریٹ) بھیجا۔ محکمہ پریس برانچ کا جو انگریز انچارج تھا وہ انٹرویو لیتے ہوئے آپ کی انگریزی زبان کی وسعت سے بہت متاثر ہوا اور انہیں کلرکوں کا انچارج لگا دیا وہ خود بھی کبھی مشکل انگلش کے الفاظ کا آسان انگریزی میں ترجمہ پوچھتا تھا۔ بعد میں والد صاحب کی ترقی ہوتی رہی اور اسی محکمہ سے ڈپٹی ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

والد صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بے اندازہ شوق تھا جب ریٹائر ہو گئے تو جلد ہی ''پاکستان ریویو'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے یہ فیروز سنز کمپنی کا رسالہ دو زبانوں انگلش اور اُردو میں ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔

مجھ سے دو بہنیں اور ایک بھائی بڑے ہیں ماشاءاللہ چار بھائی اور 2 بہنیں چھوٹی ہیں۔ سب سے چھوٹے دونوں بھائی جڑواں ہیں۔

بچپن میں پڑھائی کا شوق نہ تھا چھوٹے بہن بھائیوں سے کھیلنے میں زیادہ وقت گذرتا۔ تقسیم ہند سے ایک سال قبل گرمیوں کی چھٹیاں بٹالہ گزارنے گئے تو والد صاحب نے بہن پروین سے کہا جو کہ اس وقت چھٹی کلاس میں کہ وہ تھیں میری پڑھائی میں مدد کریں اور توجہ کریں شوق دلائیں وغیرہ وغیرہ۔

آج تک یاد ہے جب گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوسری کلاس کا پہلا امتحان ہوا تو سب مضامین میں اچھے نمبر آئے پھر پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ تعلیم وتربیت اور کھلونا رسالے گھر آنے لگے۔ چھٹی کے دن جب بھی فرصت ملتی تو والد صاحب ضرور پوچھتے کونسی کہانیاں پڑھیں اور نتیجہ کیا اخذ کیا۔ وقت کی اہمیت پر بہت نصیحت کرتے۔ علامہ اقبال کے اشعار سنا کر اچھا انسان بننے کے جذبات بیدار کرتے رہتے تھے۔

حلال رزق کی برکتیں

تقسیم ہند سے چند سال پہلے ہی بھاٹی گیٹ چھوڑ دیا تھا اور نیا گھر ضلع کچہری سے تھوڑا آگے بنالیا تھا۔ دادا جی ریلویز سے ریٹائر ہو چکے تھے وہ دادی اماں کے ساتھ اسی گھر میں رہتے تھے اور بڑی پھوپھی بیوہ ہو گئیں دو بیٹیوں کے ساتھ وہ بھی یہیں رہتی تھیں۔ چھوٹے چچا عبدالرشید کو پاکستانی ایمبیسی کابل میں اچھی سروس ملی ہوئی تھی وہ ملک سے باہر رہتے تھے والدصاحب نہایت محنت سے اپنی نوکری کرتے تھے کبھی کام گھر بھی لانا پڑتا تھا۔ ساری زندگی سائیکل پر سفر کیا۔ طبیعت میں کافی سادگی تھی۔ ہر ماہ کے شروع میں تنخواہ لاتے تو سب بانٹ دیتے والدین کو بیوہ بہن، والدہ کو گھر کا خرچہ ہم سب کو تھوڑی پاکٹ منی اور اپنے لیے تھوڑی سی بچا رکھتے تھے کہ کبھی کبھار پان کھانے کو دل کرتا یا بچوں کے لیے بسکٹ لے کر آتے تھے۔

اللہ رازق ہے

ایک مرتبہ تنخواہیں ملنی بند ہو گئیں پاکستان بنے چند سال ہوئے تھے میں پانچویں میں پڑھتی تھی۔ والدصاحب کے ایک عالمِ دین سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ دعائیں بتایا کرتے تھے حفاظت کیلئے **یا حافظ یا حفیظ یا سلام** یا ہوا تھا گھر سے باہر راستہ میں خود بھی پڑھا کرتے تھے اور ہمیں بھی کہتے تھے۔ جب کچھ مالی تنگی آئی تو حافظ صاحب نے یا اللہ یا رزاق پڑھنے کو کہا بلکہ بچوں کو بھی شام کے وقت ایک ایک تسبیح پڑھنے کو کہا گیا۔ یاد ہے زندگی میں پہلی مرتبہ تسبیح سے تعارف ہوا۔ اللہ کا کرنا تین ماہ بعد اکٹھی تنخواہیں مل گئیں۔

چچا حمید کی دُکھ بھری کہانی

چچا حمید کی باتیں بچپن میں دادی اماں اور والدصاحب سے سنا کرتے تھے مگر دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

چھوٹے چچا عبدالرشید نے مجھے اور بہن پروین کو دادا اور دادی کے ساتھ کابل کی سیر کو مدعو کیا۔ ان دنوں ان کے دو بچے نجمی اور انیس تھے۔ سب مل کر باغوں میں سیر کے لیے جاتے تھے۔ درخت پھلوں سے بھرے ہوتے ہمارا وقت بہت اچھا گذرا۔ کابل شہر بہت خوبصورت تھا۔

اس وقت میں پانچویں کلاس میں تھی۔ چچا حمید وہاں ہمیں ملنے آئے نہایت شفقت سے ملے۔ تعلیم کی طرف توجہ دینے کی نصیحت کرتے رہے۔

وہ نہایت ذہین اور قابل انسان تھے سات زبانیں آتی تھیں۔ فارسی اور اُردو کے شاعر بھی تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرر تھے اور وہیں کے ایک پروفیسر کی بیٹی سے شادی ہوئی دو بچے تھے۔ لڑکی سنا ہے میری ہم عمر تھی اور بیٹا چھوٹا تھا تقسیم کے وقت چچا نے لاہور آنے کا پروگرام بنایا تو پروفیسر صاحب نے صاف انکار کر دیا نہ خود آئے اور نہ ہی بیٹی اور بچوں کو ساتھ بھیجا۔ چچا حمید اس قدر افسردہ ہوئے کہ لاہور کی بجائے کابل چلے گئے وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ بہت سالوں بعد جب صحت خاصی خراب ہو گئی تو وہ لاہور والدصاحب کے ہاں تشریف لائے مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور بتایا کرتے تھے کہ بہت کوشش کی انڈیا جانے کی مگر کبھی ویزا نہ ملا اور نہ کبھی اپنے بچوں کو دیکھ سکے۔ درویشی کی زندگی گذاری نہ اچھا کھایا نہ اچھا پہنا، جو کمایا غریبوں مسکینوں میں بانٹ دیا۔ والدہ بتایا کرتی تھیں انہوں نے میرا نام یاسمین رکھا تو جب چچا جان کو معلوم ہوا تو انہوں نے خط لکھا کہ ثمین نام

رکھیں عربی نام ہے اوراس کا مطلب قیمتی ہے۔

سورہ فاتحہ باعث شفا

جب والدین کی شادی ہوئی تو یہ بھاٹی گیٹ کے اندر رہتے تھے چچا رشید ایم اے میں پڑھتے تھے انہیں پھیپھڑوں کی ٹی بی ہوگئی۔ ڈاکٹر فدا حسین فیملی ڈاکٹر تھے انہوں نے مرض کی تشخیص تو کر لی مگر اس زمانہ میں اس کا علاج نہ تھا۔ دادی اماں کو کسی بزرگ نے بتایا کہ لاعلاج بیماریاں سورہ فاتحہ کا پانی پلانے سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ چالیس روز باقاعدہ یہ عمل کرنا ہوتا ہے۔ فجر کی 2 سنت پڑھنے کے بعد اکتالیس (41) مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد پانی پر پھونک مارنی ہوتی ہے اور سارا وقت مریض وہی پانی پیتا ہے بیشک ایسے وظائف کے اول و آخر درود شریف ۳ یا ۷ مرتبہ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔

جب دو ماہ بعد دوبارہ X-ray ہوا تو مرض ختم ہو چکا تھا اور مریض کی شکایات (کھانسی اور بخار) بھی جاتا رہا تھا کبھی دادی اماں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکتی تھیں تو والدہ پڑھا کرتی تھیں چونکہ ناغہ نہیں کرنا ہوتا۔ مجھے والدہ صاحبہ سے یہ بات معلوم ہوئی۔

لیڈی مکلیگن گرلز ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ سکول کے زمانہ میں کھیلوں وغیرہ میں حصہ لینے کی بھی ترغیب دی جاتی تھی۔ سکول کی نیٹ بال ٹیم میں شامل تھی اور کھیلوں میں بھی تیز بھاگنا آتا تھا۔

چھٹیوں میں گھریلو کاموں میں والدہ کا ہاتھ بٹانا، کھانا پکانا سیکھنا، سلائی کڑھائی وغیرہ میں وقت صرف کرنا ہوتا تھا فارغ نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ حالانکہ گھر میں ملازمہ ہوتی اور ملازم لڑکا باہر کا سودا سلف لانے کیلئے رہتا تھا۔ والدہ کا پسندیدہ مشغلہ ملازمین کے چھوٹے بچوں کے کپڑے سینا تھا۔ عصر سے مغرب تک کا وقت اس کام کیلئے تھا۔ دوپہر کو بہت کم آرام کرتیں۔ ہمیں چھٹی کے دن بھی زیادہ دیر تک نہیں سونے دیتے تھے۔ والد صاحب کا کہنا تھا صبح کو زیادہ سونا انسان کو سست اور کاہل بنا دیتا ہے۔ والد صاحب محلّہ کے لڑکوں کو انگلش سیکھنے میں مدد دیتے مگر کبھی معاوضہ نہ لیتے تھے۔

کالج کی زندگی

لاہور کالج میں پری میڈیکل میں داخلہ ہوا۔ ان دنوں بڑی بہن ڈاکٹر تنویر فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور انہوں نے برقعہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مگر دوسری بہن پروین نے پردہ کے خلاف بغاوت کی، والد صاحب سے کالج جانے کی مشکلات بیان کیں اور سائیکل خریدنے کی درخواست کی ہمارے والد صاحب بہت روشن خیال تھے انہوں نے سائیکل منگا دی مگر دادا جان اور والدہ نے سخت مخالفت کی آخر اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ چادر لے کر جائیں گی۔

میرے لیے راستہ ہموار ہو گیا مجھے آسانی سے سائیکل مل گئی ان دنوں لاہور میں ٹریفک بہت کم ہوتی تھی چند ایک کاریں ہوتی تھیں البتہ بسیں بہت چلتی تھیں رکشہ ابھی ایجاد نہ ہوا تھا۔ عوام الناس سواری کیلئے ٹانگہ استعمال کرتے تھے۔

کالج میں خاصی محنت کرنی پڑتی تھی اس لیے کھیلوں کیلئے زیادہ وقت نہ ملتا تھا البتہ بیڈمنٹن میں اچھی مہارت حاصل ہوگئی

تھی مگر کالج ٹیم میں آنے سے انکار کر دیا کیونکہ میری سہیلیاں یاسمین اور زرینہ بہت پڑھاکو واقع ہوئی تھیں ہم اکٹھے بیٹھ کر لیکچر پہلے سے تیار بھی کیا کرتے تھے۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن آئی اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تعلیمی وظیفہ ملا جو پورے پانچ سال جاری رہا۔

ان دنوں طارق بھائی جان جو مجھ سے تھوڑے ہی بڑے ہیں نیوی میں چلے گئے تھے۔ بہن تنویر نے ڈاکٹر بننے کے بعد پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور پنجاب کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں مختلف شہروں میں سروس کرتی رہیں چھوٹا بھائی طاہران کے پاس رہتا تھا۔ بہن پروین کی ایم اے کے بعد شادی ہوگئی وہ کراچی چلی گئیں اس طرح گھر میں بڑا مجھے بنا دیا گیا چھوٹے بہن بھائیوں کے جھگڑوں میں صلح صفائی کراتی ان کی پڑھائی اور کھیل پر بھی نظر رکھتی تھی اور کھانے کے دوران ان کو مفید باتیں بتایا کرتی تھی۔ مجھے والدین کے ساتھ زیادہ وقت گذارنے کا موقع ملا۔

اس زمانہ میں میڈیکل کالج میں طالبات کم ہوتی تھیں۔ پروفیسرز بہت دلچسپی سے پڑھاتی تھیں۔ ڈاکٹر پروفیسر بشارت یوسف اناٹومی کی تھیں اور ڈاکٹر روز مدان فزیالوجی کی پروفیسر تھیں۔ تیسرا مضمون بائیو کیمسٹری اس زمانہ میں چھوٹا ہوتا تھا اور کلاسیں بھی تھوڑی ہوتی تھیں۔

اناٹمی کا مضمون بہت پسند تھا کئی مرتبہ ٹیسٹ میں زبانی امتحان میں اول پوزیشن آجاتی تھی۔ یونیورسٹی کے امتحان میں اول آنے کے شوق میں دن رات محنت شروع کر دی خوراک اور نیند کا خیال نہ رکھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایک روز شام کے قریب ڈائسیکشن ہال سے باہر نکلے تو ایک سہیلی نے کہا نیچے نئے مردے آئے ہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ تہہ خانہ کی سیڑھیاں اُترتے تین چار سہیلیوں نے ایک نظر ڈالی اور اوپر بھاگ گئیں میں نے کالے خان (جوان دنوں نئے مردوں کے اندر دوائی ڈالتے تھے) کو دیکھا اور سوچا کتنی بہادری ہے اتنے مُردوں میں اکیلا انسان۔ مجھے بہت عجیب محسوس ہونے لگا۔ گھر پہنچتے بیہوش ہوگئی۔ اگلے دن ہوش آیا تو دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

روحانی علاج سے پہلا واسطہ

والدین کیلئے یہ سخت پریشانی کا وقت تھا۔ والد صاحب نے ڈاکٹر کے مشورہ سے دوائیاں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو والدہ نے منع کر دیا یہ جواب دے کر "پھر ساری زندگی دوائیوں پر پڑی رہے گی" انہیں ایک صوفیہ عالمہ کا پتہ تھا جو قرآن اور حدیث سے علاج کر سکتی تھیں۔ ان کے مشورہ کے مطابق جو بھی وہ سورتیں/دعائیں بتاتی تھیں والدہ پڑھنے کے بعد مجھے وہی پانی دیتیں اور کھانا بھی میرا الگ بنتا۔ سر میں مالش کیلئے تیل پر بھی وہی سورتیں دم کرتی تھیں۔ بیشک والدہ صاحبہ نے بہت محنت کی۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد دماغ کھلنا شروع ہوا تھوڑی چیزیں سمجھ آنے لگیں تو مجھے ان باجی جی کے پاس لے کر گئیں تا کہ خود ان سے حسبِ حال دعائیں پوچھوں۔ انہوں نے مجھے سورہ فاتحہ کا وظیفہ بتایا۔ اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف اور گیارہ مرتبہ سورہ فاتحہ گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص اس سے استخارہ بھی کرتے ہیں اور یہ وظیفہ حاجت کیلئے بھی پڑھا

جاتا ہے رات کی نماز کے آخری دو نفل پڑھتے ہوئے استخارہ یا حاجت کی نیت کرتے ہیں۔ میں نے دن میں ایک مرتبہ دعا استخارہ اور رات کو یہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا سات دن میں دل مطمئن ہو گیا کہ مجھے ستمبر میں امتحان دینا چاہیے۔ پروفیسر صاحبان سے بات کی تو انہوں نے بھی میرے فیصلہ سے اتفاق کیا۔ بچپن میں زبان میں لکنت تھی۔ کئی الفاظ زبان ٹھیک ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے روحانی علاج باجی ہاشمی کے ذریعہ ہوا۔ سورہ طٰہٰ کی حضرت موسیٰ والی دعا بتائی رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ☆ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ☆ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ☆ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ☆

ترجمہ: ''اے میرے رب میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام آسان کر دے، اور لکنت دور فرما دے (یا گرہ کھول دے) تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

میڈیکل کالج کے باقی سال بخیریت گذر گئے آخری سال میں اچھے نمبر آئے۔ سرجری میں پروفیسر سرجن احمد توفیق خان صاحب کے ساتھ ہاؤس جاب شروع کیا وہ اچھے سرجن کے ساتھ ساتھ بہت اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔ اچھے انسان بننے کی باتیں بھی کام کے دوران کبھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر اور سٹوڈنٹ کے رشتہ داروں سے بھی اپنے پرائیویٹ کلینک میں فیس نہ لیتے تھے۔

ایک المناک حادثہ

ہاؤس جاب کے دوران ایک ہولناک سا حادثہ دیکھنے میں آیا۔ ایک رات میری اور مرحومہ ڈاکٹر خدیجہ عثمان کی ڈیوٹی تھی تقریباً رات کے نو بجے ایک نوجوان 22/23 سال عمر مردانہ وارڈ میں داخل ہوا ہمیں ایمرجنسی کال آئی فوراً پہنچے اس کے پیٹ کے وسط میں ایک گہرا زخم تھا جس میں سے بے اندازہ خون رواں تھا جو کسی صورت بند نہیں ہو رہا تھا۔ سرجن ڈاکٹر نثار فاطمہ کال پر تھیں وہ جلدی ہی پہنچ گئیں فوری طور پر آپریشن تھیٹر میں پہنچا کر خون کی بوتل لگائی گئی۔ پیٹ کھولنے پر معلوم ہوا پورا پیٹ خون سے بھرا پڑا ہے۔ بہت کوشش کے بعد خون کی بڑی شریان پر کٹ پکڑا گیا اس کی مرمت بھی ہوئی مگر اس دوران نوجوان کی حالت تشویش ناک ہو چکی تھی۔ خون مسلسل اس کے جا رہا تھا مگر جو ضائع ہوا وہ بہت زیادہ تھا۔ گھنٹہ کے اندر اندر اس لڑکے نے دم توڑ دیا۔ یہ پولیس کیس بن گیا تھا۔ واقعہ یوں ہوا یہ لڑکا اپنے واقف کار کے ساتھ حجام کی دکان پر بیٹھا تھا جس سے اس لڑکے نے قرضہ لے رکھا تھا اس نے قرضہ واپس کرنے کا مطالبہ کیا یہ لڑکا ٹال مٹول کرنے لگا اس نے طیش میں آ کر حجام کی چھوٹی تیز قینچی اٹھا کر سیدھی پیٹ میں مار ڈالی۔ پیٹ کے درمیان میں بڑی رگ پر زخم ہوا یکدم بے اندازہ خون نکلا لڑکا بیہوش ہو گیا اور اسی حالت میں گنگا رام ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوا۔

اس کے فوت ہونے پر قتل کا مقدمہ چلا جس کی گواہی کیلئے مجھے اور ڈاکٹر خدیجہ مرحومہ کو ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا۔ چند ماہ بعد جب ہم وہاں پہنچے، کورٹ کا ہال لوگوں سے بھرا ہوا۔ بہت سے سرکاری لوگ یونیفارم میں پولیس افسران اور جج حضرات موجود تھے۔ اس لمحہ خیال آیا ہمارے رب کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ گواہی دینے کے لئے ایک عورت کے ساتھ دوسری کو بھی بلانے کا قانون بنا دیا۔

ہاؤس جاب کے دوران اتنا کچھ سیکھ لیا دل چاہتا تھا سرجن ہی بن جانا چاہیے۔مگر عملی طور پر ایک خاتون ڈاکٹر کیلئے شادی کو کامیابی سے نبھانا اور اچھا سرجن بننا خاصا مشکل قسم کا جوڑ ہے۔ بڑی بہن ڈاکٹر تنویر کی شادی کی بات پکی ہوئی 1964ء میں ڈاکٹر نعیم اقبال[1] انگلستان DMRD کرنے گئے ہوئے تھے وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور حافظ قرآن بھی ہیں۔بہن تنویر نے پردہ اپنے شوق سے کیا تھا۔انہوں نے سفید کوٹ اور سفید نقاب خود ہی ڈیزائن کیا تھا جو کہ بعد میں جمعیت کی ڈاکٹرز نے اپنایا۔

اللہ کی شان بلند، ڈاکٹر نعیم اقبال کے اہل خانہ بھی شریعت کے پابند اور غلط قسم کی رسومات کے خلاف تھے۔ نہایت دیندار قسم کے مخلص لوگ ہیں۔

ہاؤس جاب کے بعد میری بات بھی پکی ہوگئی۔ڈاکٹر محمد ذکاء الدین، بھائی جان طارق کے سکول کے دوست تھے اور ان کی دونوں چھوٹی بہنیں (نسرین اور تحسین) سے میری اور چھوٹی بہن آصفہ کی دوستی تھی۔ یہ انگلستان سے ماہر نفسیات کی ڈگری لینے گئے ہوئے تھے۔1966ء میں پہلے بڑی بہن کی شادی ہوئی پھر میری ہوگئی۔2 سال پہلے بھائی جان طارق اور حمیرا بھابھی کی بھی شادی ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر ذکاء نے تمام کاغذات مکمل کیے ہوئے تھے۔ برطانیہ کی ایمبیسی میں ایک ہی انٹرویو میں ویزا مل گیا ہم اکٹھے ہی لاہور سے روانہ ہوئے چند دن لندن کی سیر کیلئے بچائے ہوئے تھے۔ان کا گہرا دوست ڈاکٹر اعجاز شفیع اور بیگم ڈاکٹر نیلوفر ان دنوں لندن میں تھے اس لیے انہی کے ہاں رہائش پذیر رہے۔تھوڑے دنوں میں کافی حد تک لندن دیکھ لیا۔

سکاٹ لینڈ پہنچتے ہی ان کی نوکری شروع ہوگئی۔ووڈلی ہسپتال گلاسکو شہر سے چند میل باہر خوبصورت پہاڑیوں کے قریب ایک نفسیاتی ہسپتال تھا۔تھوڑے دن فلیٹ کو سیٹ کرنے کے بعد ڈائریکٹر نے میرا انٹرویو لیا اور ایک عارضی جاب دینے پر راضی ہوگیا ویسے بھی مجھے بچوں کی بیماریوں میں کام کرنا تھا اور قریب کے ایک شہر میں بچوں کے وارڈ میں ہاؤس جاب بک کرالیا تھا۔

ایک سال بعد کچھ چھٹیاں تھیں چند دوستوں کے ساتھ مل کر یورپ کی سیر کو گئے۔ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی نئی گاڑی میں جرمنی تک سفر کیا۔ڈاکٹر ذکاء کی چھوٹی بہن تحسین بھی ان دنوں ہمارے پاس تھیں بعد میں ان کی شادی ڈاکٹر عبدالرزاق قاضی سے ہوئی جو ایڈنبرا سے سرجن بن رہے تھے۔

وقت تیزی سے گذرتا رہا۔اللہ تعالیٰ نے بیٹا اویس عطا کیا وہ ایک سال کا تھا ۱۹۶۹ء میں پاکستان چھٹیوں کیلئے آئے۔

ہمارے مذہبی عقائد ایک سے تھے مگر عملی طور پر میں تو کچھ نمازیں اور تھوڑا قرآن پاک کبھی پڑھ لیتی تھی مگر یہ کہتے تھے جب اللہ تعالیٰ کی سمجھ آئے گی تو تم سے بہتر مسلمان بنوں گا۔

<u>یورپ کی سیریں</u>

1970ء میں سپین فرانس اور سوئٹزر لینڈ (Switzerland) کی سیر کو گئے۔سپین کے شہر غرناطہ اور قرطبہ دیکھ کر پرانے وقتوں کی یادیں آج تک دماغ میں گھومتی

[1] مولوی ظفر اقبال کے صاحبزادے، بنت الاسلام اور سعیدہ احسن کے بھائی

ہیں۔الحمراءتو کیا زبردست عمارت ہے مسلمانوں کے فن تعمیر کا
جیتا جاگتا نمونہ!اس کی زیارت کے بعد اس عمارت سے نکلنے کو
دل نہ کرتا تھا دماغ ماضی کی حسین یادوں میں پورا دن کھویا
رہا۔(جاری ہے) ☆☆

چلتے چلتے

''ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے خلاف ملک گیر مظاہرے، ریلیاں، کئی شہروں میں ہڑتال۔ اسلام آباد میں شہریوں کو امریکی سفارتخانے جانے سے روک دیا گیا پولیس کے لاٹھی چارج۔لاہور میں امریکی قونصلیٹ بند کر دیا گیا۔
جماعت اسلامی، تحریک انصاف، جماعۃ الدعوہ، سنی اتحاد کونسل کی اپیل پر ریلیاں جمعہ کے اجتماعات میں مذمتی قرادادیں منظور''

یادش بخیر! مارچ کے ''چلتے چلتے'' میں ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا ''......لیکن یہ تو عوام کی خواہش ہے ہوگا تو وہی جو خواص چاہیں گے اور خواص کیا چاہیں گے؟ یہ سب پرعیاں ہے مزید عیاں و بیاں ان سطور کے چھپتے چھپتے ہو جائے گا۔''

تو لیجئے صاحب! عیاں ہو گیا۔فرمان جاری ہو گیا اور ریمنڈ ڈیوس صاحب خصوصی طیارے کے ذریعے پاکستان سے اڑان بھر کر چلے بھی گئے بمعہ اپنے تمام جاسوسی ثبوتوں کے۔ان کے نکل جانے کے بعد قوم کو اس خبر کی ہوا لگنے دی اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اعجاز چوہدری صاحب! جو پہلے ہی ایک دفعہ کسی تقریب میں فرما چکے تھے کہ ''لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں انصاف کرنا مشکل ہو گیا......'' اب اس تازہ جھوٹ پر نہ جانے کیا سوچ رہے ہوں گے ''عدالت کے فیصلے کا احترام کریں گے'' کی مسلسل رٹ لگانے والے یوں اندر خانے امریکہ سے ساز باز کر کے قومی غیرت وحمیت کا جنازہ نکالیں گے۔کیا یہ قوم کے ساتھ جھوٹ اور دھوکہ دہی میں نہیں آتا؟

اسلام کا دشمن اور جہاد کو کچلنے کا آرزومند امریکہ اب اسلامی قانون کی پناہ لے بیٹھا ہے اور دیت کے نام پر اپنا آدمی اور پاکستان کا دشمن و جاسوس اور تین نوجوانوں کا قاتل بڑے اعزاز و تکریم سے چھڑا لے گیا ہے......نہ دیت لینے والوں کا سراغ چھوڑا ہے نہ فیصلہ کرنے والے سامنے آئے ہیں۔یہ کیسی دیت ہے جس میں ہر کوئی روپوش ہو گیا ہے......جب معاملہ صاف تھا، حق پر یہ سب کچھ ہوا تو پھر یہ چھپنا چھپانا کیسا؟ گویا دال میں کچھ کالا ہے بلکہ پوری دال ہی کالی سیاہ ہے جیسے ہمارے حاکموں کے دل کالے سیاہ ہیں۔ان کالے دل والوں کے کالے کرتوتوں کا نتیجہ ہے کہ قوم زخم پہ زخم کھائے جا رہی ہے۔سقوطِ ڈھاکہ، سانحہ جامعہ حفصہ، عہد بھٹو، عہد بے نظیر، عہدِ مشرف اور اب عہد زرداری گویا نری خواری

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جایئے زخموں کے لگے ہیں انبار

''جاپان: شدید زلزلے اور سونامی سے زبردست تباہی۔ ہلاکتیں 50 ہزار سے تجاوز'' جاپانی معیشت کو 100 ارب ڈالر کا نقصان۔ ہیروشیما کے ایٹمی بجلی گھر کے ری ایکٹر میں

دھماکے، 8.9 ریکٹر سکیل کا زلزلہ''

جمعہ، گیارہ مارچ 2011ء کو جاپان میں تین سو سالہ تاریخ کا ہولناک زلزلہ آیا پورا شہر پانی کی دس میٹر دیوار کے آگے ریت کی طرح بہہ گیا بلٹ پروف، شاک پروف غرض ہر قسم کے نقصان پروف کی حامل گاڑیاں، عمارتیں چشم زدن میں کھلونوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئیں اور کئی شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ یہ ہے اس قادر مطلق کی قدرت و طاقت اور اس کے تخلیق کردہ آدمی کی ضعیفی و کمزوری۔ فاعتبروا یا اولی الابصار مگر انسان ہے کہ پھر بھی عقل کے ناخن نہیں لیتا۔ اللہ کی طرف نہیں جھکتا...... قوموں کے زوال کی ......اللہ کے عذاب کی قرآن پاک میں جا بجا وضاحت کی گئی ہے اور وجوہات بیان کی گئی ہیں مگر نفس ہے کہ اطاعت پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، سمجھتا ہے کہ یہ سختیاں تو اوروں کے لئے ہیں میں تو محفوظ ہوں۔ جیسے ہمارے گیلانی شاہ صاحب جاپان کے زلزلے پر فرماتے ہیں کہ پاکستان کی طرف نہیں آئے گا۔ کیا یہ آزمائشیں ...... یہ عذاب کے کوڑے کسی سے پوچھ کر آتے ہیں؟ مشرف صاحب نے بھی سب سے پہلے پاکستان کہہ کر امریکہ کو گھر کے اندر سے گزرنے کا راستہ دیا اب پاکستان اس کے زیر عتاب ہے...... لیبیا میں اس کی بمباری جاری ہے، عراق میں کیا ہوا؟ افغانستان میں کیا ہو رہا ہے؟ ایران کیوں آنکھ میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے؟ یہ باتیں...... یہ حالات......ان خیالات کا پس منظر ہم جانتے ہیں۔ ہمارے بچے تک امریکہ کی نیت اور ارادوں کو جانتے ہیں ایک اسلامی ممالک کے حکمران ہی کچھ نہیں جانتے؟ وہ اتنے بھولے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے منہ کی بجائے کان میں نوالہ ڈال لیتے ہیں؟ جی نہیں......ان کی سمجھ، لیاقت ہم سے سوا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ان کی ساری لیاقت، ذہانت اور سیاست ان کے ذاتی مفادات کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ اپریل کا مہینہ ہے۔ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔ نوجوانوں کو شاہین بننے کا سبق دیا تھا۔ قومِ رسولؐ ہاشمی ہونے پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ مغرب کی کھوکھلی تہذیب کے بارے میں کھول کھول کر بتایا تھا مگر آج اقبال کا پاکستان کس حال میں ہے؟

امیر الاسلام ہاشمی نے کیسی تصویر کشی کی ہے۔

؎ بیباکی و حق گوئی سے گھبراتا ہے مومن
مکاری و روباہی پر اتراتا ہے مومن
جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا ڈر ہو
وہ رزق بڑے شوق سے اب کھاتا ہے مومن
اقبالؔ تیرے دیس کا کیا حال سناؤں
جھگڑے یہاں صوبوں کے، ذاتوں کے، نسب کے
اگتے ہیں تہِ سایۂ گل، خار غضب کے
یہ دیس ہے سب کا ، مگر اس کا نہیں کوئی
اس کے تنِ خستہ پہ تو اب دانت ہیں سب کے
اقبالؔ تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

☆......☆......☆

''پنجاب اسمبلی میں شدید ہنگامہ آرائی۔ لوٹے لہرا دیئے گئے۔ وزیر اعلیٰ اعتماد کا ووٹ لیں......لوٹے کے نعرے، مال روڈ پر پی پی پی کے ارکان اسمبلی نے لوٹے اٹھا کر احتجاج کیا''

خبر کیا ہے، اج تے ہوگئی لوٹا لوٹا کی عکاس ہے۔ اس امت کی آزمائش مال ہے، فرمایا صادق و امین رسول اکرم بشیر و نذیر ﷺ نے۔ اب دیکھئے کیسے کیسے لوگ اس ہوس زر کے لئے پینترے بدلتے ہیں......خوشامد اگلتے ہیں اور نوٹوں کی چمک سے اندھے ہوکر بکتے ہیں گرتے ہیں...... دائیں یا بائیں لڑھکتے ہیں اور آخرکار 'لوٹے' کا خطاب پاتے ہیں اور

اس پر ے شرم ان کو مگر نہیں آتی

لوٹا طہارت کا نشان ہے......اس سے وضو بھی کیا جاتا ہے مگر ہمارے سیاسی لوٹوں کی اخلاقی حالت دیکھ کر اگر لوٹے کو زبان مل جائے تو وہ بھی ان حضرات کی اپنے سے مماثلت کرنے پر شدید احتجاج کرے لیکن بے چارہ بے زبان برتن ہے کوئی اس کے ساتھ کیسے، ویسے ویسے، جیسے جیسے لوگوں کو جوڑ دے اس نے کیا کہہ لینا ہے۔

ہمارے یہ سیاسی آج ہی لوٹا نہیں کہلائے بلکہ جب بھی انہوں نے سیاسی مفادات کی خاطر پارٹیاں بدلیں ......وفا داریاں بدلیں سیاسی قلا بازیاں لگائیں لوٹے کی اصطلاح ان پر منطبق ہوگئی۔ غالبًا پہلے پہل 1993ء میں جب اس وقت کے صدر نے اسمبلیاں توڑ دیں اور غدر سا مچا تو پھر سیاست دانوں نے سیاسی قلا بازیاں خوب لگائیں تب سے لوٹے کی پھبتی ان پر کسی مہربان نے ایسی کسی کے اب اس سے بہتر کوئی نام نہیں ملتا۔ اس سے پہلے لفافہ جرنلزم بکاؤ صحافیوں کے لئے بڑا مشہور لقب تھا۔ آیئے منیر نیازی کے ایک کالم کے ذریعے لوٹے کی ،یعنی سیاسی لوٹے کی تاریخ پیدائش معلوم کرتے ہیں۔

''ہمارے ترقی پذیر ملک میں سرعت سے حرکت کرتے ہوئے ماحول میں کچھ دن گھوڑے اور لفافے زبان زدِعام رہے مگر جلد ہی آؤٹ آف فیشن ہو گئے ان کی جگہ لوٹوں نے لے لی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قیام پاکستان سے پہلے ایک سیاسی رہنما ڈاکٹر عالم ہوا کرتے تھے جو ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں لڑھکنے کی وجہ سے پہلے بے پیندے لوٹے کہلائے پھر مستقل طور پر ڈاکٹر عالم لوٹا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اب ہمارے ترقی پذیر ملک میں اذہان تیزی سے حرکت تو کرتے ہیں مگر تخلیقی جوہر سے محروم ہونے کے سبب انہیں مشکل وقت میں پیچھے کی طرف دوڑنا پڑتا ہے اور ایک خاص وقت میں گزارے کے لئے ماضی کے گودام سے جو مل جائے اسے استعمال میں لے آتے ہیں۔ ''لوٹا'' جو لوگوں نے غریب رشتہ داروں کی طرح چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ یک لخت یوں منظر عام پر آ گیا ہے کہ مرد تو مرد خواتین تک اسے یوں لیے پھرتی ہیں جیسے یہ 'لوٹا' نہ ہو، بیرونی ملک سے کسی متمول عزیز کا بھیجا ہوا ڈش انٹینا ہو۔

(''لوٹے ، جمہوریت اور سرمایہ دار'' منیر نیازی روزنامہ جنگ 7 جولائی 1993ء)

گویا وہ دن جائے اور آج کا دن آئے ہمارے سیاستدانوں نے لوٹا نہیں چھوڑا بلکہ اپنی کرتوتوں سے سراپا لوٹا بن کر رہ گئے ہیں اور کچھ ایسا دور آ گیا ہے کہ اپنی جاہ پرستی، مال پرستی پر شرمسار ہونے کی بجائے خوش وخرم اپنی قیمتیں لگواتے ہیں اور خوشی خوشی وصول بھی کرتے ہیں۔ شاید یہ کبھی آئینے کے سامنے یا تنہائی میں جھوم جھوم کر...... چٹکیاں بجا بجا کر......گھوم

گھوم کر گاتے بھی ہوں۔

لوٹا ہوں

میں لوٹا ہوں

شکل وصورت پر نہ جاؤ

اندر سے میں کھوٹا ہوں......لوٹا ہوں

جتنے بھی سیاسی اتحاد بنے

میں ان کا جمال گھوٹا ہوں......لوٹا ہوں

ملک وملت میں کیا جانوں

خلوص وفا میں چھوٹا ہوں......لوٹا ہوں......میں لوٹا ہوں

کبھی ہم خوبصورت تھے......

معزز قارئین اس عنوان کو پڑھ کر ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کس دکھی دل کی آواز ہے۔ شاید کوئی ادھیڑ عمر خاتون اپنی جوانی اور خوبصورتی کو یاد کر کے ٹھنڈی آہ بھر رہی ہے۔

ارے جائیے بھی! نہ تو ابھی ہم ادھیڑ عمر ہیں اور نہ ہی ہمارے حسن کو گہن لگا ہے۔ ہمارے حسن میں تو خیر کسی کو شک کرنے کی اجازت ہی نہیں کہ خالق کائنات نے خود ہی ہمیں ''احسن تقویم'' کہہ دیا۔ چلئے پہیلیوں سے باہر آ یئے ہم خود ہی قصہ مختصر کیے دیتے ہیں۔ دراصل یہاں اس حسن و خوبصورتی کا بیان مقصود نہیں ہے جسے شعرا اپنی غزلوں میں سراہتے ہیں اور جسے ''لڑکے کی اماں'' چراغ ہاتھوں میں لے کر ڈھونڈنے نکلتی ہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں ذکر کرنے بیٹھے ہیں اپنے خیالات، اپنے احساسات اور تخیلات یعنی Imagination کی خوبصورتی کا۔ ان پیارے پیارے نازک اور دلربا خیالات کا ذکر کریں گے جنھوں نے نوجوانی میں دھیرے دھیرے دل و دماغ پر قبضہ جمایا۔ ہمارے اندر پیارے پیارے احساسات جگائے۔ ہمیں خواب دیکھنے سکھائے ولولے پیدا کیے۔ رات کے پہروں میں جاگنا اور سوچتے رہنا سکھایا پھر وہ الفاظ کی صورت میں ڈھلنا شروع ہوئے اور ایک وقت آیا کہ وہ قلم کی زبان بن کر رواں بھی ہوئے۔ اور جناب عالی! یہ بات ہے کچھ نہیں کچھ نہیں تو بیس برس پہلے کی (ارے ارے کہیں آپ ہماری عمر کا حساب لگانے نہ بیٹھ جایئے گا)۔

تو ہم ذکر چھیڑ چکے ہیں اپنی نوجوانی کا۔ آپ جانیں کہ یہ ۱۵، ۱۶ برس کی عمر بھی کیا حسین شے ہوتی ہے۔ لاابالی اور بے فکری کی زندگی ...... کتابوں سے محبت کی زندگی ...... پھولوں سے عشق اور شعروں، نظموں سے پیار کی زندگی......! خوش قسمتی سے والدین ہمارے شعر و ادب کے شیدائی اور کتابوں کے رسیا ہیں۔ والد صاحب جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تو اکثر غالب، درد، فیض وغیرہ کے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے تھے۔ سو خیالات کی نازک آفرینی ورثے میں ہی مل گئی تھی۔ ذرا بڑے ہوئے تو کچھ کچھ اشعار سمجھ آنے لگے۔ جس کتاب کو پڑھتے اسی میں ڈوب جاتے۔ آس پاس کے ماحول سے بے خبر، ڈور بیل بج رہی ہے یا اماں بلا رہی ہیں ہمیں کچھ علم نہ ہوتا۔ پاؤں تو زمین پر ہوتے مگر خیالات کی پرواز ......مت پوچھئے! زمان و مکان کی سب حدیں پار کر کے کبھی مدینہ کی گلیوں میں پھر رہے ہوتے، کبھی سپین اور استنبول میں مسلمانوں کا دور زریں دیکھ رہے ہوتے۔ جس زمانے میں نسیم حجازی کا چسکا لگا اس وقت تو حال یہ تھا کہ بیت المقدس کی فتح کے وقت ہم گویا صلاح الدین ایوبی کے ہم رکاب تھے اور ''الحمراء'' کا آخری دیدار کرتے ہوئے ٹپاٹپ آنسو گرا رہے ہوتے تھے۔ جب ہم

گھنٹوں بعد کمرے سے نکلتے، آنکھیں سوجی ہوئی اور موڈ خراب، چہرے پر اداسی تو والدہ پوچھتیں کیا ہوا؟؟ ہم جواب دیتے "کچھ نہیں امی، محمد بن قاسم کو ظالموں نے مار ڈالا۔امی! کیوں کیا، انھوں نے ایسا کیوں کیا؟؟؟" اب امی بیچاری اس سوال کا کیا جواب دیتیں۔

ہائے ہائے!! کیا بتائیں آپ کو کہ کیا دور تھا۔کراچی میں بارشیں دعاؤں ہی سے آیا کرتی تھیں۔سو جب بھی بادل گھر کر آتے اور جل تھل کر دیتے تو دل کی بڑی جذباتی اور رومانوی کیفیت ہوتی۔جی چاہتا کہ کھلے آسمان تلے کھڑے ہو کر بس بھیگتے رہیں۔اگرچہ بڑے ہوتے ہی امی نے ٹیرس یا چھت پر چڑھ کر بھیگنے سے منع کر دیا تھا اس لیے کھڑکی سے ہی نظارے کرتے اور پکوڑے کھاتے۔ایسی ہی ایک سہانی بارش کی شام ہم نے "انشاجی" کی "اک بار کہو تم میری ہو" پڑھتے پڑھتے زبانی یاد کر لی۔اس کے کچھ اشعار آج تک یاد ہیں، چلیں آپ بھی سنیں۔

جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

اس کے بعد زندگی نے نیا موڑ لیا۔ہم نے جامعہ کراچی میں قدم رکھا۔یہاں پر اللہ کا احسان اور کرم ہم پر یوں ہوا کہ ایسی پیاری پیاری ساتھی طالبات، دوستیں اور بہنیں میسر آ گئیں جنھوں نے سکھایا کہ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں......

اب ان ٹھنڈے میٹھے چشموں کی طرح بہتے جذبات پر عشق حقیقی کی چھاپ لگنی شروع ہوئی۔ہمیں خیالات سے تو پہلے ہی پیار تھا اور سوچنے سے دلچسپی۔سو جب یہ میدان ملا تو ہم اس کے شہسوار بن گئے۔ہم نے اللہ کی خاطر جڑنا سیکھا، اس کی خاطر محبت کرنا، با مقصد زندگی کے معنی سیکھے اور پھر یہ ہوا کہ اپنے اندر کے چھپے ہوئے جواہر بھی ہم پر کھلنا شروع ہو گئے۔ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خود کچھ لکھ سکتے ہیں مگر جمعیت نے قلم پکڑا دیا۔ہم کافی بے ربط بولنے کے عادی تھے۔پھر جمعیت نے ہی مربوط اور با معنی جملے کہنا سکھایا اور چار لوگوں میں زبان کھولنے کی ہمت دلائی اور نہ جانے کیا کیا سکھایا کچھ اس طرح کہ وہ چار سال بقیہ آنے والی زندگی کے لیے "زادِ راہ" بن گئے۔

لیجیے! ہم تو چلے تھے آپ کو بتانے کہ "کبھی ہم خوبصورت تھے" اور یہاں ہم بہک گئے......اور آپ کو بھی ساتھ ساتھ بہکا لیا اپنے ماضی کی کہانیاں سنانے میں۔آپ ضرور پوچھیں گے کہ بھئی اب کیا ایسا ہو گیا؟ کہاں گئی وہ نکتہ آفرینی، وہ جذبات و احساسات کی بارشیں وہ رم جھم اور وہ پھوہاریں وہ بہتے دریا؟؟؟؟ تو جی صبر سے سنیے ذرا! آخر یہی تو بتانے کے لیے اتنی تمہید باندھی تھی۔

لیجیے! اب زندگی کا اہم ترین موڑ بلکہ یوٹرن کہہ لیجیے وہ آتا ہے اور ہم خیالات کی دنیا سے عمل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ارے اب اتنے نادان بھی نہ بنئے۔آپ سمجھے نہیں کیا؟

بھئی ہماری خیر سے شادی خانہ آبادی ہو جاتی ہے......اب تو سمجھ آ گئی ناں!

شادی کے بعد گھر بدلا، ملک بدلا، لوگ بدلے اور زبان بدلی۔ یعنی کہ ہم کراچی سے براہ راست پرواز کرتے ہوئے نیویارک کی سرزمین پر وارد ہوئے۔ وہاں پر اترتے ہی جو حالات پیش آئے تو سمجھئے کہ یہ حال تھا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

نہیں سمجھ آئی؟؟ چلئے ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم جب آنکھوں میں سپنے سجائے، دنیا گھومنے کے خواب بسائے اپنے سیاں جی کے پاس پہنچے تو اولاً استقبال تو اچھا سا بلکہ شاندار سا ملا مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی پتہ چلا کہ تین گھنٹے کا سفر کر کے اپنے شہر پہنچیں گے اور نیوجرسی میں ''خان کی دکان'' سے گروسری کرتے ہوئے جائیں گے۔ پھر میاں جی نے خان کی دکان کے گن گانے شروع کیے کہ حلال گوست مہینے بھر کا یہیں سے لیتے ہیں۔ شان اور نیشنل کے سب مصالحے ملتے ہیں اور تو اور روح افزا بھی مل جاتا ہے۔ ہم اس ''رومانوی گفتگو'' کے سحر میں کھوئے ہوئے خان کی دکان میں داخل ہوئے اور چلئے جی ...... وہ دن اور آج کا دن ...... ہم نے یہ سبق اپنے پلو سے باندھ لیا کہ ''میاں کے دل کا راستہ واقعی معدے سے ہو کر گزرتا ہے''۔ یوں نئی نویلی دلہن کے ارمان دل میں سجائے ہم اپنے پیارے سے گھر کے کچن میں رونق افروز ہوئے۔ پھر یہاں سے ہماری ''غیر رومانوی زندگی'' کا جو سفر شروع ہوا تو نہ پوچھئے کہ کتنی پتیلیاں جلائیں اور کتنے کباب...... اب کچھ راز بھی رہنے دیجیے!

ایک اور مزیدار واقعہ سنئے۔ پہلی بار نیویارک شہر گھومنے گئے۔ ہم واقعی انسانی ترقی کے اس شاہکار کو حیران ہو ہو کر دیکھے گئے۔ ہم نے تو ان مرحومین یعنی Twin Towers کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جنھوں نے ۱۱-۹ کے بعد دنیا کی قسمت کو بدل ڈالا۔ بہرحال! قصہ یہ ہے کہ ہم گاڑی میں بیٹھے Sky Skrapers کے نظارے میں محو ہیں اور میاں جی کی آواز آتی ہے ''سنو! ذرا لسٹ بنا لو کہ کون کون سی دالوں اور مصالحوں کی ضرورت ہے یہاں کے دیسی اسٹور کا سامان بہت اچھا اور تازہ ہوتا ہے۔''

اب آپ ہی بتایئے قارئین! یہ لڑائی والی بات ہے کہ نہیں؟ ہم نے تو اس پر بآواز بلند احتجاج کیا اور جواب دیا ''حضور! ہم یہاں نیویارک گھومنے آئے ہیں، دال چاول کا حساب لگانے نہیں۔ ہمیں مزا کرنے دیں۔''

پھر وقت کچھ اس تیزی سے گزرتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی پریکٹیکل لائف کے دھندوں میں اس طرح گھرتے چلے گئے کہ کبھی کبھی تنہائی میسر آتی تو ہم سوچتے، پرانے خطوط نکالتے، کارڈز کھولتے، ایسے لمحوں میں دل زبردست احتجاج شروع کر دیتا۔ ہم دیر تک بے وجہ ہی بے چین سے رہتے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہوتا مگر ہم مطمئن نہ ہو پاتے۔ دل ہم سے پوچھتا ''سنو! یہ تم ہی ہو؟؟'' ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ پھر اگلا سوال آتا ''یہ لہسن، پیاز، ادرک پیسنے، بچوں کے دودھ بنانے، نیپی بدلنے، کپڑے لتے کے جھگڑوں، دعوتوں، صفائیوں کے جھمیلوں میں ''خود'' کہاں کھو گئی ہو؟؟ وہ پیارے پیارے جذبے کیا ہوئے؟ وہ بادلوں

کی سیر، وہ برکھارت کیا ہوئی؟''

چنداماموں سے تو بچپن ہی سے دوستی تھی۔ چاندنی رات میں کھڑکی پر بیٹھے اکثر دیکھتے رہتے تھے۔لیکن اب تو حال یہ کہ ہفتوں مہینوں دیدار ہی نصیب نہ ہوتا۔بس اپنے پیارے پیارے چاند ستاروں کے پیچھے بھاگ بھاگ کے دن بھر کے تھکے ہارے رات کو ہم نڈھال ہوکر بستر پر گرتے اور بے خبر سو جاتے۔اب ہم اپنے دلِ بے چین کو کیا جواب دیتے!

پھر ایک دن ساتھیو! ہمیں اپنے اس دلِ بے چین کے سوال کا جواب مل ہی گیا۔تب ہی تو آپ کو یہ ساری کہانی سنانے کے لیے قلم اٹھایا۔ ہوا یوں کہ ہماری سات سالہ بیٹی صاحبہ نے جھولوں کی پینگیں بھرتے ہوئے کہا''امی جب میں خوب اونچا جھولتی ہوں اور آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں آسمانوں میں اڑ رہی ہوں''......بس یہی وہ لمحہ تھا جب ہم نے اپنے دل سے کہا''سنا تم نے؟؟ کچھ سمجھ آیا تمھیں؟؟ ہماری خوبصورتی، ہمارے خیالات کی رفعت اور ہمارے تخیل کی پرواز کہیں کھوئی نہیں ہے۔ یہ تو منتقل ہو رہی ہے۔قطرہ قطرہ...... جیسے بوتل سے پانی گرایا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ بوتل پوری خالی ہوجاتی ہے مگر گلاس......وہ پورا کا پورا بھر جاتا ہے......بس یہی ہمارے رب کا قانون ہے اور ہم اپنے رب کی ہر عطا پر اس کے آگے شکر کے ساتھ سربسجود ہیں۔ ہم نے اپنی خوبصورتی آنے والی نسل کو دے دی ہے۔ بتایئے قارئین! صحیح کیا ہے ناں ہم نے؟

۞۞۞

میری لائبریری سے

کتاب: قرآن پر عمل

مصنفہ: سمیہ رمضان (ترجمہ محمد ظہیر الدین بھٹی)

پبلشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔

ذرا ٹھہریئے! کتاب کا نام پڑھ کر آگے مت رکیے۔ یہ کوئی وعظ ونصحت، تجوید، قلقلے کی کتاب نہیں بلکہ یہ اپنی زندگی سے غم کا علاج ڈھونڈنے کی کتاب ہے۔ کہیں کسی سکالر کے لیکچر میں خوبصورت فقرہ سنا تھا کہ ''قرآن پڑھنے والا قاری اور اس پر عمل کرنے والا مومن ہوتا ہے......'' قارئین یہ کتاب عام، ہم جیسے، چلتے پھرتے کھانے پینے میں مشغول دنیاداروں کو مومن بنانے کا نسخہ فراہم کرتی ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ، اندازِ بیان سادہ اور پرتاثیر ہے کہ مکمل کر کے انسان وہ قیمتی نگینہ حاصل کر کے ہی اٹھتا ہے جسے ہدایت کہا جاتا ہے اور بن مانگے یہ پیغمبروں، ولیوں کی اولادوں کو بھی نہیں ملتی۔

دعویٰ نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ کتاب مکمل کر کے آپ محسوس کریں گے کہ کم از کم ایک دفعہ اس ہدایت نے آپ کے درِ دل پر دستک ضرور دی ہے۔ دستک ایمان کی اور کان بہرے ہوں تو اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے لیکن ایک دفعہ جب آپ یہ پڑھیں گے کہ یہ کتاب تین سال کی قلیل مدت میں آٹھ دفعہ شائع ہو چکی ہے تو آپ کو کتاب کی افادیت کا علم بغیر کھولے ہی ہو جائے گا۔

آیئے قرآن پر عمل کے پیش لفظ میں پہنچتے ہیں۔

یہ کتاب دراصل کویت کے رسالہ ''المجتمع'' میں محترمہ سمیہ رمضان کے دروس کی روداد پر مشتمل ہے وہ زبانی کلامی درس اور تبلیغ کی بجائے ایک اچھوتا انداز اپناتی ہیں اور وہ یہ کہ ہر دفعہ ایک آیت منتخب کر کے اس کے ترجمہ تفسیر کے ساتھ خواتین کو اس پر عمل کا طریقہ بتا کر عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ اگلی دفعہ اس درس میں سامعات کو دعوت عام دی جاتی ہے کہ وہ اس آیت پر عمل کے دوران پیش آنے والے واقعات یا ردعمل بیان کریں۔ یوں یہ کتاب قرآن مجید کی چودہ آیات اور ان پر عمل کی داستانوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب انقلاب بالقرآن اور اس کے تقاضوں پر مشتمل ہے۔ باب کے آغاز میں مسند احمد سے خوبصورت حدیث بیان کی گئی ہے۔

''جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ قرآن میں ہے اس پر عمل کیا اس کے ماں باپ کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا۔''

اور اس حدیث کی شرح میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ہماری کتاب کا مقصد قرأت کے اجر و ثواب کی شان کم کرنا نہیں بلکہ مسلمانوں کے عملی رویہ کی تبدیلی ہے ...... یہ عملی رویہ کیسے تبدیل ہوگا آیئے یہ واقعہ پڑھیں۔

''ایک خداترس خاتون نے ایک بچی کو اپنے گھر میں رکھا اس بچی کے ماں باپ غریب اور اس کے اخراجات پورے کرنے سے قاصر تھے۔ مالکن نے اس بچی کو ہر سہولت فراہم کی اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ بچی بڑی ہوگئی تو مالکن نے خادمہ کو فارغ کر کے گھر کے کام اس کے سپرد کر دیے۔ صبح سویرے سب کام ایک کاغذ پر لکھ کر اس کے حوالے کر دیے۔ بچی کو نہلانا، سبزی بنانا، کپڑے دھونا وغیرہ وغیرہ...... دوپہر کو مالکن واپس آئی تو مالکن نے دیکھا کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا پوچھا تو جواب ملا''میں نے اس تحریر کو بہت احترام سے پڑھا اور چوما ہے......اسے اتنا پڑھا ہے کہ زبانی یاد ہوگئی ہے۔''

کیا آپ بتا سکتی ہیں اس پر مالکن کا ردعمل کیا ہوگا۔ قرآن چونکہ معجزہ اور زندہ کتاب ہونے کے ساتھ زبردست قوت تاثیر رکھتی ہے۔قرطبی نے لکھا ہے''اگر پہاڑوں کو عقل دی جاتی اور اس قرآن کے ذریعہ خطاب کیا جاتا تو اپنی سختی اور مضبوطی کے باوجود خوفِ خدا سے پھٹ جاتے۔''

قرآن پر عمل کرنے میں ترجمان اور نمونہ کامل آپؐ کی ہستی ہے اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی سیرت کا مطالعہ بھی کریں۔ چونکہ قرآن آپؐ پر نازل ہوا، سب سے بہتر اسے آپ نے ہی سمجھا۔ آپؐ نے اس پر تدبر کا حق ادا کیا اور اس کی سب سے بہتر تعلیم دینے اور ان تعلیمات پر عمل کرنے والے بھی آپؐ تھے۔

صحابہ کرامؓ کے قرآن پر عمل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قرآن کو جلد جلد پڑھ ڈالنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایک رات میں دو یا تین قرآن پڑھ ڈالتے ہیں......انھوں نے فرمایا''ان لوگوں نے پڑھا مگر نہ پڑھا، رسول اللہؐ پوری رات قیام فرماتے سورۃ البقرہ، آل عمران اور دیگر سورتیں پڑھتے اگر اس میں خوشخبری ہوتی تو طلب کرتے اور اگر ایسی آیت پڑھتے جس میں ڈرایا گیا ہے تو اللہ سے اس کی پناہ مانگتے۔''

دوسرے باب قرآن سے استفادے کا درست طریقہ میں چند نکات بیان کیے ہیں۔

(۱) اتنی دلچسپی کہ تمام تر توجہات کا مرکز بن جائے (عمل میں تبدیلی ایک دم نہیں بتدریج آتی ہے)۔

(۲) مناسب جگہ: قرآن ایسا معزز مہمان ہے جس سے شوروشغب سے خالی پرسکون جگہ پر ملاقات کریں۔

(۳) موزوں وقت: جب چستی توانائی کے ساتھ ذہنی آمادگی ہو، نیند، درد وغیرہ میں مطالعہ قرآن نہ کریں وضو میں مسواک کا خاص اہتمام کریں۔

(۴) ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا: تلاوت کا مقصد قرآن ختم کرنے کے بجائے ایمان و یقین میں اضافہ ہو۔

(۵) توجہ: الفاظ کو معانی سے الگ کر کے مت پڑھیں۔ ایک آیت کو مطلب کے حصول کے لیے بار بار پڑھیں۔

(۶) سر تسلیم خم: پڑھتے وقت قرآن میں کیے جانے والے سوالوں کے جواب دیں۔ سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر، استغفراللہ کے کلمات حسب موقع و محل ادا کریں۔

(۷) ہدف: تدبر کے ساتھ شروع کیا......بس چند دن ، پھر پرانی ڈگر پر آ گئے۔ تدبر کا آسان طریقہ سیاق و سباق کو ذہن میں رکھنا اور خالی تلاوت کے لئے الگ وقت، تفسیر کے

لیے الگ وقت مختص کریں۔

تلاوت کا مقصد ''دل کو زندہ کرنا ہے جو تفسیر کے بغیر ممکن نہیں''۔

(۸) آیت کو بار بار پڑھنا: قلب ایمان کا محل ہے اس میں جتنا ایمان ہوگا اتنے ہی اعمال صالح ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ اکثر ایک ہی آیت کی بار بار تلاوت میں مصروف رہتے۔

☆ ہفتہ وار دروس قرآن کے سلسلہ میں پہلا موضوع ''گھر میں چیخنا چلانا'' ہے...... لکھتی ہیں درس قرآن کے بعد ایک خاتون بولیں ''اور تو سب خامیوں پر قابو پالیا ہے بس ایک کمزوری ہے جس سے جان نہیں چھڑا سکی اور وہ ہے اونچی آواز میں چلّانے کا مرض......''

لیجیے جناب اونچی آواز میں چیخنے چلانے کا مرض سامنے آیا تو سمیہ رمضان قرآن کی سورہ لقمان سے علاج تجویز کرتی ہیں۔

(ترجمہ) ''اور اپنی آواز ذرا پست رکھو، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہے۔''

اس آیت پر عمل کا طریقہ بیان کرنے کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ مریضہ کہتی ہیں: میری پڑوسن نے مجھے فون کیا اور خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا ''میں نے کئی دن سے آپ کی آواز نہیں سنی؟ خیریت ہے؟'' ویسے اونچا بولنے کی وجہ بھی سنتے جائیں، ایک بچے کو جوتا نہیں مل رہا دوسرے کو پین، تیسرے کو بستہ، ظاہر ہے چیخنا ضروری ٹھہرتا ہے......۔

عمل: جب بھی اونچی آواز میں بولنا شروع کریں تو یہ تصور میں لائیں کہ آپ کا منہ سرخ اور شکل گدھے کی سی ہو رہی ہے۔...... لکھتی ہیں یقین کریں جب بھی چیخنا شروع کرتی مجھے لگتا میں انسانوں سے نکل کر حیوانوں کی صف میں شامل ہوگئی ہوں ...... یہ تصور آتے ہی میرا چہرہ نرم پڑ جاتا آواز پست ہو جاتی اور میں کہتی۔ ''تم نے اپنی ضروری چیزیں کل ہی بستے میں کیوں نہ رکھ لیں۔''

یوں یہ مشکل ترین مرحلہ آہستہ آہستہ آسان ہوتا گیا۔

مریضہ لکھتی ہیں: ''میں امتحان میں کامیاب ہوگئی جی ہاں میں پاس ہوگئی میرا پرسکون لہجہ دیکھ کر پہلے تو میرا خاوند پریشان ہوا پوچھنے لگا تم بیمار تو نہیں ہو؟ میں نے جواب دیا ''جی ہاں میں مریضہ تھی اللہ نے قرآن پر عمل کے ذریعہ شفا دے دی۔''

☆ قارئین اگر میں آپ سے سوال کروں کہ نماز فجر کے لیے کون فجر سے قبل ہی اٹھ بیٹھتا ہے تو جواب میں چند لوگ ہوں گے...... یہی مرض اور بہت سی جنت سے غافل خواتین کو تھا جو نماز فجر کی اذان سن کر بھی سوئی رہتیں......ان میں سے جب ایک خاتون نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ اس مبارک وقت میں ہم گھر والے شیطان کی گرفت میں ہوتے تھے اللہ کے فرشتے ہمیں نمازیوں میں نہ پا کر لوٹ جاتے ......ارادہ باندھتی مگر عمل کی نوبت نہ آتی یہ مسئلہ انھوں نے سمیہ رمضان کے سامنے رکھا تو انھوں نے سورۃ الشعراء سے اس کا حل پیش کیا۔

(ترجمہ) ''جو تمھیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمھاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے......''

عمل: موذن کے اللہ اکبر کے کلمات سن کر مسلمان

ہونے کا احساس پیدا کرو......موذن کے یہ کلمات کسی اور کو نہیں مجھے پکار رہے ہیں اور رب کی رحمت قریب آ گئی ہے......۔

پہلی دفعہ تو اذان میں اللہ اکبر کے کلمات سے سستی چھائی رہی بستر پر کروٹیں بدلتی رہی ......شیطان بھی روزانہ کی طرح سست ہی کرتا رہا ایک دم مجھے محسوس ہوا میں کمرے میں تنہا نہیں ہوں میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو میری شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے اس کی قربت کا احساس ہوتے ہی وضو کیا اور نماز فجر کے لیے مالک کے سامنے کھڑی ہو گئی ......یہی تو وہ نماز تھی جس کے پڑھنے کی مجھے حسرت رہی۔ خوب رو رو کر گذشتہ قضا نمازوں پر معافی مانگی اور پر سکون ہو گئی۔ گذشتہ زندگی کولھو کا بیل ہی محسوس ہوئی تمام کوتاہیاں کمیاں سامنے آئیں۔ اتنے میں خاوند کے خراٹے سنائی دیے۔ دل چاہا انھیں اٹھاؤں، اپنی کیفیت سے آگاہ کروں میں نے انھیں نام لے کر اٹھانے کی بجائے سورۃ الشعراء کی آیت پڑھی۔ یہ آیت سن کر میرے شوہر اٹھے ...... وضو کیا، نماز پڑھی اور کہنے لگے ''آج کی صبح کتنی مبارک اور حسین ہے۔''

میں نے وہی آیت پھر تلاوت کی۔ میرے شوہر نے کہا میں تمھیں ایک عجیب بات بتاتا ہوں کل گاڑی میں گھر واپس آتے ہوئے میں ریڈیو کی سوئی گھما رہا تھا تو یہ قرآن اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ میں نے چاہا اس اسٹیشن سے سوئی ہٹا دوں لیکن اس سے پہلے ٹریفک پولیس نے مجھے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ مجھے قرآن سنتے ہوئے احساس ہوا دراصل میرا اللہ مجھ سے خطاب کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

(ترجمہ): ''اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ روزِ آخرت پوری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی۔''

اس آیت نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے...... مجھے اس آیت سے سکون اور حلاوت ملی......میرے رب کا فضل مجھ پر آج اس وقت پورا ہوا جب تم نے فجر کی نماز کے لیے اٹھایا ......تم نے نہیں اٹھایا بلکہ پروردگار نے جگایا۔ میرے اور تمھارے مشترکہ عمل سے یہ آیت زندہ متحرک ہوئی......۔

پورا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے اختتام میں یوں ہے کہ ''میرے خاوند کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ بچوں کے کمرے کی جانب بڑھا کمرے کی لائٹ آن کی پھر آف کر دی...... چند بار ایسا کیا تو بچے جاگ اٹھے اس نے نماز کے لیے زور سے اللہ اکبر کہا۔ بچے حیران پریشان تھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے رفیق زندگی نے کہا ''دیکھو تو تمھیں ملنے کون آیا ہے اور تمھیں اب دیکھ بھی رہا ہے......اس کے بعد میرے خاوند نے وہی آیت تلاوت کی اور کہا۔

''آج فجر کی نماز گھر میں پڑھ لو، کل سے ان شاء اللہ مسجد میں جائیں گے۔''

☆ تیسرا موضوع طلاق ہے...... نام کی طرح سفاک اور سنگین مسئلے لیے اور ان مسائل کی نوعیت بھی ویسی ہی ہے جیسی ہمارے ہندوانہ مزاج کے معاشرہ میں درپیش ہوتی ہے ......مطلب صاف ظاہر ہے۔ قرآن طلاق کا مفہوم اور طریقہ کار بتلاتا ہے اس کے بالکل برعکس۔ چونکہ طلاق مستحکم ہنستے بستے گھرانوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ طلاق کے بعد مشکلات کا ایسا چکر چل پڑتا ہے جو دنوں مہینوں میں نہیں

سالوں تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ گھر نحوست کدہ بن جاتا ہے۔

سورۃ الطلاق کی آیت میں اس کا صحیح طریقہ پڑھا تو درس میں شامل ایک خاتون نے پکار کر کہا "ذرا ٹھہریے...... یہ آپ لوگ کیا بات کر رہے ہیں؟ کیا طلاق یافتہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورانِ عدت اپنے گھر میں ٹھہرے؟" میں نے اس عورت پر واضح کیا کہ یہ میرا نہیں رب رحیم کا حکم ہے تا کہ اس دوران موافقت کی صورت پیدا ہو سکے! غصہ، نفرت، اشتعال کا ماحول شیطان کے لیے موسم بہار ہوتا ہے معاملات کی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور علیحدگی کی نوبت آ جاتی ہے...... یہ سن کر وہ عورت کہنے لگی "ہائے میری بدبختی...... اس آیت سے ناواقفیت میرے گھر کی تباہی کا باعث بنی، میرے اور میرے خاوند کے درمیان معمولی سا اختلاف ہوا میں نے بلاوجہ چند اشتعال انگیز باتیں کر دیں اس کا غیض وغضب انتہا کو جا پہنچا اس نے طلاق کا لفظ بول دیا ...... میں نے جلدی سے سامان باندھا اور میکے جا پہنچی۔ میری کہانی سن کر میرے میکے کا ہر فرد میرے خاوند سے توہین کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔

میرے خاوند نے کہلا بھیجا گھر واپس آ جاؤ میں نے اس کی پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی یوں میرے نفس نے اور میری انانیت نے مجھے غور وفکر اور درست فیصلہ سے محروم کر دیا۔"

وہ بار بار کہہ رہی تھی یہ آیت تو میں بار بار پڑھتی تھی کاش میں اس کا مطلب سمجھتی۔ عدت گزرنے کے بعد ہم میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی عدت کے دوران اپنے گھر سے نکلنے کے گناہ کا ارتکاب بھی کیا خاوند سے بھی محروم ہوئی اور اللہ کے واضح حکم کی مخالفت کا گناہ بھی مول لیا۔"

کچھ عرصہ کے بعد درس سننے اور عمل پیرا ہونے کا عہد کرنے والی خواتین نے اپنے اپنے تجربات بیان کیے۔

"ایک بہن نے کہا جب سے میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ میرے قول وعمل پر آیت کریمہ کی ہی حکمرانی ہوگی تو میں ہمیشہ دعا کرتی تھی کہ جب حقیقی عمل کا موقع آئے تو یا اللہ مجھے استقامت دینا تا کہ میں عملاً قرآن کے مطابق عمل کروں...... میرا خاوند جذباتی آدمی ہے اکثر غصے میں اول فول بکنے لگتا ہے۔ اس آیت پر عمل سے پہلے میں بھی مشتعل ہو جاتی تھی اور ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر ہمارا چھوٹا بیٹا چپ چاپ رہتا۔ صدمے سے کچھ نہ بولتا اور ہم میاں بیوی اپنی بات پر ڈٹے رہتے۔

یہ منظر پھر سامنے آیا لیکن اب میرے دل کی کیفیت بدل چکی تھی۔ میں نے اللہ سے مدد مانگ کر آیت پر عمل کا فیصلہ کیا ...... آج میری پوری کوشش یہ تھی کہ بس خاوند کو مشتعل نہ کروں۔ مجھ پر بے قراری اور بے چینی کی کیفیت طاری تھی۔ کبھی میرے دل میں آتا کسی ہمدرد دوست کے پاس چلی جاؤں کبھی کچھ......ادھر خاوند بھی آپے سے باہر ہو رہا تھا...... کئی بار جواب دینے کا خیال آیا میں نے ہر بار ذکر تسبیح شروع کر دی......ساتھ ہی یہ سوچتی رہی کہ خاوند نے اگر طلاق دے دی تو عدت میں گھر سے باہر نہ جا سکوں گی۔ درس سے ناغہ ہوگا کیا اس سے بھی محروم ہو جاؤں گی؟ درس قرآن نے تو میری زندگی میں تابندگی پیدا کی تھی...... پہلے تو تلاوت گلے سے نیچے

نہ اترتی تھی عمل میں تو اب آئی تھی۔

آہستہ آہستہ خاوند کا غصہ کم ہونے لگا...... میں بھی ذکر اذکار میں مصروف رہی...... بعدازاں جب اس کا غصہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو کہنے لگا ''میں بہت معذرت خواہ ہوں مجھے برابر اس بات کا اندیشہ رہا کہ تم جواب دو گی...... آج طلاق کا لفظ میرے ہونٹوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں حیران ہوں کہ آج تم نے طلاق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا...... پہلے تم طلاق کا مطالبہ کرتی تھیں مگر میں طلاق نہیں دیتا تھا آج میں نے ہمیشہ کے نزاع کو ختم کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور سوچا تھا تمھارے مطالبے پر تڑاق سے طلاق دے دوں گا...... ویسے تم نے آج طلاق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟'' میں نے جواب دیا:

''میرے رب نے مجھے اپنی کتاب کے ذریعے اور احکام کے ذریعہ ادب سکھایا ہے پہلے میں سوچا کرتی تھی طلاق لے کر آزادی مل جائے گی مگر تب میری سوچ اللہ کی کتاب کی عملی تفسیر سے یکسر متصادم تھی۔''

اس بہن نے یہ داستان سنا کر ہمیں بتایا ''اس دن کے بعد اب تک ہم گھر میں خوش وخرم رہ رہے ہیں۔ ایسا امن سکون اطمینان ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ پہلے شیطان طلاق کو آزادی بنا کر پیش کرتا تھا جبکہ فی الحقیقت طلاق میں پابندی ہے......اس واقعہ کے بعد خاوند کے رویے میں بھی لچک پیدا ہو گئی ہے اس نے غیض وغضب، عناد پر قابو پا لیا ہے کیونکہ میرے پرسکون ردعمل پر اسے بہت معذرت کرنا پڑی تھی۔''

قارئین چونکہ آج کے انتشار اور بدامنی میں ہر شخص جلد باز بن کر طلاق دے دیتا ہے لہٰذا اس میں بہت سی خواتین کے طلاق کے موضوع پر مسائل تحریر ہیں۔ عدت کے دوران رجوع جیسے فقہی مسائل آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

طلاق کے واقعات کے بعد اور بھی بہت سے موضوعات ہیں جو متفرق ابواب میں ڈسکس کیے گئے ہیں۔ ایک کالم اس کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن یہ عنوانات اور ان کا تعارف دینے میں کوئی ہرج نہیں۔

☆ لڑنا جھگڑنا...... رشتہ داروں سے ناراضگی قطع تعلق ......جس میں سورۃ حم السجدہ کی آیت ''تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی تمھارا جگری دوست بن گیا ہے۔''

ایسے حساس موضوع پر کس قدر عمدہ فرمانِ الٰہی ......اور کیسے عمل ہوتا ہے اس پر...... کتاب میں ایک خاتون اپنی نند کے ساتھ جھگڑے کا بتاتی ہیں کہ میں نے اس کے ناگوار رویے سے تھک کر اس سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا اس نے میرے اس فیصلے کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ میری نند، میرے شوہر کی بہن میرے بچوں کی پھوپھی ہے مگر شیطان نے بہکا کر اس فیصلہ کو خوش نما بنا دیا۔ قرآن پر عمل کے نتیجہ میں اس آیت کو سن کر فیصلہ یہی ہوا کہ ملنا چاہیے۔ فیصلہ کر لینا آسان اور عمل مشکل تھا۔ میں مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ اس ناراضی کو ختم کروں اور جلد ہی مجھے موقع مل گیا مجھے معلوم ہوا کہ میری نند ہسپتال میں داخل ہے اس کے ہاں تیسرے بچہ کی ولادت ہوئی تھی میں نے اپنے خاوند سے اصرار کیا کہ مجھے اپنے ساتھ ہسپتال لے جائے۔ پہلے تو وہ حیران ہوا پھر بڑی خوشی سے

اپنے ساتھ لے گیا۔ میرا دل زور سے دھک دھک کر رہا تھا میں نے دروازہ کھولا اور مسکراہٹ کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں نے اپنی نند کو بچے کی پیدائش پر اور اس کی جان کی سلامتی پر مبارکباد دی مگر نند نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنے بھائی سے ہی باتیں کرتی رہی۔ میرا خاوند پریشان تھا اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

میں نے نومولود کو گود میں اٹھایا اسے پیار کیا۔ نند کو بتایا کہ بچہ بہت خوبصورت ہے اور ان شاء اللہ سعادت مند بنے گا۔

میری باتیں سن کر وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ملاقات ختم ہوئی میں کار میں آ کر بیٹھی اور سرد آہ کھینچی جو میرے خاوند نے سن لی۔ میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا کہ میں کبھی ہار نہیں مانوں گی اللہ کا کلام سچا ہے سارے اندیشے غلط ہیں میں نے تو حسن سلوک کیا اب صرف ''جگری دوست'' بننا رہ گیا ہے، مجھے صبر کرنا ہوگا اور صبر کے لیے ظاہر ہے وقت درکار ہے۔ گھر پہنچتے ہی تمام اندیشوں کو میں نے دل و دماغ سے دور جھٹکا اور بدی کو نیکی سے بدلنے کا عزم کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے نتائج مفید ہوں گے۔ اگلے دن نند کے متعلق علم ہوا کہ میرے اس طرزِ عمل پر وہ خوش ہے میں نے اگلے دن کھانا تیار کیا، اس کے بچوں کو پیار کیا کھانا لے کر نند کے پاس گئی۔ اب میری نند میری طرف ملتفت تھی اس نے مجھے عقیقے کی تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں شرکت کے لیے گئی تو اس نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ میں نے بھی اسے گلے لگایا اب وہی نند مجھے سب عورتوں سے محبوب ہے۔''

جب اس خاتون نے اپنا تجربہ بیان کیا تو مصنفہ نے کہا آپ کی نند میں تبدیلی اس لیے آئی کہ آپ نے پہل کی آپ کے سامنے ایک ہدف تھا وہ تھا اللہ کی رضا......آپ نے اس کے لیے قرآن کا ذریعہ اختیار کیا اللہ سے مدد طلب کی، صبر کیا اللہ تو دلوں کا خالق اور جسموں کا مالک ہے اس نے دلوں کو آپ کے لیے گداز کر دیا دشمنی دوستی میں بدل گئی۔

اس کے بعد پورے باب میں دیگر رشتوں کے حوالے سے بھی کئی ایمان افروز اور دلچسپ واقعات ہیں۔

چونکہ کالم طویل تر ہوتا جا رہا ہے آیئے اب چیدہ چیدہ فقرے اور موضوعات۔

☆ نفرت و کدورت: خاوند سے دلی نفرت کو سورہ حم السجدہ کی اس آیت پر عمل سے ختم کیا۔ ''اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ وہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔''

☆ تسبیح: اللہ کی تسبیح کون سی مخلوق کس انداز میں کر رہی ہے اور آپ اس تسبیح میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں۔ متعدد واقعات اس آیت کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔

''کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو

مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو......'' بے جان چیزوں کی تسبیح کا ذکر کرنے کے بعد مصنفہ لکھتی ہیں ''مسلمان تسبیح کرتے وقت ایک خوشگوار بلکہ شاندار ذہنی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے اسے تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا......کوئی کام آسان کرنے اور خوشگوار نتائج کے لیے کچھ تسبیحات کا ذکر ہے۔ اب کچھ ذیلی

عنوانات:

☆TV اور دیواروں کی تسبیح

☆تسبیح کی برکت سے گناہ کبیرہ چھوڑ دیا

☆تسبیح کے بچوں پر اثرات

☆کتاب میں ساتواں درس والدین سے حسن سلوک کا ہے جس میں پانچ مختلف خواتین نے اپنے تجربات بیان کیے ہیں۔ لاشعوری طور پر والدین کی نافرمانی (اونچی آواز میں بات، تکرار وغیرہ) کا ذکر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ **وقل لهما قولا کریما** کی تفسیر میں بہت عجیب واقعات اچھوتے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

☆میراث: میراث اللہ کی حدوں میں سے ایک حد ہے اسے اللہ نے خود مقرر فرمایا ہے اسے کسی انسان کی مرضی اور صوابدید پر نہیں چھوڑا۔ زیورات، جائیداد کے ورثے کا تعلق ''اگر میت کی وارث دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہے تو آدھا ورثہ اس کا ہے'' (النساء) پر عمل سے ہے۔

میراث کی صحیح تقسیم میں رکاوٹ ''خواہشات'' بنتی ہیں۔ سب سے اہم بات ورثے کی بروقت تقسیم ہے جس سے ہم غافل ہیں۔ غافل خواتین اس سے کیسے تائب ہوئیں یہ آپ کو کتاب سے علم ہوگا۔ مزید موضوعات:

☆نفسیاتی کیفیت کا شکار نوجوان

☆مزاروں پر دعائیں

☆حاجات اللہ پوری کرتا ہے

☆جن نکالنا

☆غیب کا علم اللہ کے سوائے کسی کو نہیں

☆اولاد کے لیے دعا

ان موضوعات پر قرآنی آیات، واقعات اور دعاؤں پر مبنی واقعات آنکھیں کھولتے اور دل کو جھنجھوڑتے ہیں...... آپ کو ان واقعات کا علم ضرور ہونا چاہیے کہ کل روز محشر یہ نہ کہہ پائیں گی کہ ہمیں کون سا پتہ تھا۔ جن سعید روحوں کے یہ واقعات بیان کیے گئے ہیں انھوں نے نہ صرف پتہ چلایا بلکہ عمل کے لیے قدم اٹھایا اور اللہ ان کا مددگار رہا۔

قارئین! اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ یہ سب جاننے کے لیے ۱۵۷ صفحات کی کتاب (قیمت ۱۱۰ روپے) خرید کر پڑھتے ہیں یا ادھار...... بس ہمیں دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے۔ اگلی کتاب تک اللہ حافظ۔

شہر اچھے کہ بن......

''فیسروافی الارض'' کے حکم کی تعمیل کا موقع ملا تو ہم رمضان میں بھی ایشیا کے سحرانگیز ملک سری لنکا کی سیر کا پروگرام بنا بیٹھے ۔آپ بھی کائنات کے اس حسین خطے کی جھلک دیکھئے......

۳۱اگست ۲۰۱۰ء

آج ہم دونوں کا روزہ جدّہ ائیر پورٹ پر کھلا ۔ چیک اِن کاؤنٹرز پر شلوار قمیض پہنے کھڑی سری لنکن عورتیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں ۔البتہ جہاز پر چڑھتے ہی ہمارے استقبال کے لئے کھڑی، ''آئیوبوآن'' (خوش آمدید) کہتی ہوئی میزبان کی ناکافی ساڑھی دیکھ کر بدمزگی ہوئی۔

پانچ گھنٹے کی فلائٹ سوتے جاگتے ، پہلو بدلتے بدلتے آخر گزر ہی گئی ۔ جب منزل کے قریب پہنچے تو سورج طلوع ہونے والا تھا ۔ دور ایک نارنجی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی ۔بادلوں سے نکل کر پھیلتی سورج کی پہلی کرنیں بہت ہی پیارے رنگ بکھیر رہی تھیں ۔میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ نیچے دیکھا تو بادل ہی بادل تھے ۔اتنے زیادہ کہ آسمان دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔ جہاز نیچے آنے لگا تو وہ روئی کے گالے بڑے بڑے پہاڑ معلوم ہونے لگے ۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ،جھولتے اور جھٹکے کھاتے ہوئے ہم زمین پر اتر گئے۔

ائیر پورٹ سے ہی گاڑی اور ڈرائیور کرائے پر لے لیا۔ میاں صاحب کے انتظار میں راہداری میں بنی کھڑکی سے باہر جھانکا تو دل خوش ہو گیا ۔سری لنکا پہلی نظر میں ہی بہت متاثر کن تھا ۔ دور تک بچھی نرم گھاس ، ہرے بھرے درخت اور پھولوں کے پودوں سے آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں ۔ وہیں میرا استقبال کرنے ایک ہمنگ برڈ(humming Bird دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ) بھی کہیں سے اڑتا ہوا آ گیا ۔اپنی کھونٹے (ہک) جیسی چونچ سے میرے سامنے لگے پھولوں کا رس چوسنے لگا۔

ائیر پورٹ سے نکلے تو صبح کے تقریباً ساڑھے چھ بجے تھے ۔سارا شہر جاگ رہا تھا ۔سڑکوں پر بہت رش تھا ۔دوکانیں کھل چکی تھیں ۔ چھوٹی چھوٹی ،تنگ مگر پکی سڑکیں دورویہ تھیں ۔پولیس کے سپاہی جگہ جگہ چھپے کھڑے تھے ۔پیدل چلنے والوں کے لئے ٹریفک رکوا بھی رہے تھے ۔رکشے بھی چل رہے تھے ۔ یہاں انہیں ''ٹکٹک'' کہتے ہیں ۔ایک ٹکٹک میں چلتی پھرتی بیکری بھی دیکھی ۔

عورتیں ساڑھی ،سکرٹس یا چوڑی پاجامے پہنے ہوئے تھیں ۔مردوں نے پینٹ شرٹ یا دھوتی باندھ رکھی تھی ۔کولمبو شہر کی ہریالی دیکھ کر بے اختیار مری یاد آ گیا ۔البتہ سری لنکا میں قیام کے دوران یوں لگا کہ وہاں کے لوگوں نے کبھی کسی پودے

کو نہیں چھیڑا۔ جہاں کسی بوٹے نے سر اٹھایا، قدآور درخت بن گیا۔ پورا ملک ہی ایک گھنا جنگل سا لگتا تھا۔

ہمارا کمرہ ماؤنٹ لیوینیا کے ہوٹل میں بک تھا۔ وہاں پہنچتے ہی سو گئے۔ تازہ دم ہوکر سیدھا سمندر کے ساحل پر گئے جو ہوٹل کے عین پیچھے تھا۔ ریت میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کپڑے اور بند جوتے پانی سے بچانے کے لئے اسی پر اکتفا کیا اور مقامی عجائب گھر دیکھنے چلے گئے۔ عجائب گھر کافی بڑا تھا۔ ۱۴ گیلریاں تھیں۔ باہر اس کے احاطے میں دو پرانے پرانے درخت تھے۔ ان میں سے ایک تو صدیوں پر محیط لگتا تھا۔ دور دور تک اس کی جڑیں اور شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے نیچے چھوٹی چھوٹی تختیوں پر انگریزی میں درج تھا کہ:

''اس درخت کے نیچے انتظار کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے''

میں نے کہا کہ ہونہ ہو اس پر جنات کا بسیرا ہے۔ زیادہ دیر ان کے گھر کے پاس بھٹکیں تو ناراض ہو جاتے ہوں گے۔ میاں صاحب نہ مانے اور ایک مقامی بندے سے وجہ پوچھ بیٹھے۔ اس نے کہا کہ ان کی شاخیں گرتی ہیں مگر مجھے پھر بھی یقین نہ آیا۔ بھلا وہ کیوں ہمیں جنوں کے بسیرے کی حقیقت بتلائے گا۔ یوں بھی وہاں کے لوگ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں۔ اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی خوش مزاجی سے جیبیں بھی خالی کروا لیتے ہیں، اسی لئے ہر تفریحی، تاریخی مقام پر پردیسیوں کی ٹکٹ دیسیوں سے واقعتاً کم از کم سو گنا زیادہ ہے۔ یہاں بھی کیمرہ پاس کے نام پر الگ سے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔

اندر داخل ہوتے ہی سامنے بدھا کا بڑا سا بت ایستادہ ہے۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی ہیں۔ وہ چوکڑی مارے بیٹھا ہے۔ پورے عجائب گھر میں بت بھرے پڑے تھے مگر یہ سب سے بڑا اور شاندار تھا۔ یہ خطہ تاریخی لحاظ سے بھی اہم ہے۔ ان کے سکّے، ہتھیار، اوزار، برتن، زیور سبھی کچھ تھا، پتھر کی بڑی سِلوں پر خط کشیدہ عبارات تھیں۔ مدھم مدھم، کچھ مٹی ہوئی۔ انہی میں سے ایک پر بسم اللہ اور عربی میں بھی کچھ لکھا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنائیت اور خوشی کا احساس ہوا۔

ان لوگوں کا پانی صاف کرنے کا طریقہ بھی دیکھا۔ بہت ہی حیران کن تھا۔ مٹی کا ایک چکنا گھڑا تھا۔ اسے ایک اسٹینڈ پر رکھ کر نیچے خالی برتن رکھا تھا۔ گھڑے میں پانی ڈال کر رکھ دیتے تھے۔ وہ گھنٹوں اس میں پڑا رہتا تھا یہاں تک کہ وہ برتن پانی چوس لیتا تھا۔ پھر جب اس کی دیواریں پانی سے بھر جاتی تھیں تو وہ اس کے نیچے سے ٹپکنے لگتا تھا۔ یوں ساری گندگی اس گھڑے میں رہ جاتی اور جو پانی نیچے آتا، وہ بقول ان کے انتہائی صاف ہوتا تھا۔

میں دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھی مگر عجائب گھر کے عجائبات ختم ہونے میں ہی نہ آ رہے تھے۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے ہم بس تقریباً آنکھیں موندے چیزوں کے پاس سے گزر رہے تھے۔

افطاری کا کچھ سامان خرید کر ہم کشتی رانی کرنے پہنچ گئے۔ پیڈل والی کشتیاں تھیں۔ swan کی شکل کی تھیں۔ دیکھنے میں تو بہت پیاری تھیں۔ چلانے لگے تو اندازہ ہوا کہ اس ہنس کو دھکیلنا آسان نہیں ہے۔ پہلے تو خوب پاؤں مارے۔ پھر اس بطخ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ بھی پانی پر تیرتی تیرتی ہمیں

کنارے تک لے گئی۔

اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ہم بدھ کا مندر دیکھنے نکل پڑے۔ وہاں پہنچے تو ڈرائیور نے کہا کہ جوتے گاڑی میں ہی اتار دو (وہ ''لیشانتا'' نامی ایک مقامی آدمی تھا۔ اردو بولتا تھا۔ اس نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ مقامی زبان بھی سکھاتا رہا۔ اچھا بندہ تھا۔) بہر حال ہم نے جوتے وہیں اتار دیے۔ ننگے پاؤں ہی سڑکیں ناپنے لگے۔ البتہ وہاں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم نے بھلے چنگے لوگوں کو جوتوں کے بغیر گھومتے دیکھا۔ اب اللہ ہی جانے یہ وہاں کا فیشن تھا یا ان عاجز لوگوں کا کوئی ادب!!

باہر کے احاطے میں چھوٹی چھوٹی مورتیاں پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں ہندوؤں کے کئی بازوؤں والے اور ہاتھی کی شکل والے بت بھی ادب سے رکھے تھے۔ اندر داخل ہوئے تو لمحہ بھر کے لئے مرعوب ہو کر رہ گئے۔ ایک اونچی اونچی دیواروں والا کمرہ تھا۔ اس میں دیو ہیکل، چھت جتنے اونچے گوتم بدھ کے بت ہی بت تھے۔ لوگ خاموشی سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ان کا خیال آنے لگا جنھوں نے انہیں تراشا ہوگا۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے...... اپنے ہاتھوں سے اپنے خدا کو بناتے ہوئے......

شاید انہیں اپنے آپ پر فخر ہوتا ہو...... بیچارے!

کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلے تو جیتا جاگتا ہاتھی اپنے مہاوت کے ساتھ کھڑا تھا۔ دیکھنے میں بہت بوڑھا تھا۔ اس کے دکھانے کے دانت بہت ہی لمبے ہو چکے تھے۔ مجھے تو اس سے بہت ہی ڈر لگا۔ میاں صاحب جا کر اسے ہاتھ لگانے لگے۔ ہم وہیں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے تو اس نے پانی کی پچکاری ماری کہ اب یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے غصے سے ڈر کر چلتے ہی بن پڑی۔

ایک درخت کے ارد گرد لوگ چکر لگا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں مٹی کے برتن میں پانی پکڑ رکھا تھا۔ ہر چکر کے بعد تھوڑا سا پانی درخت کو ڈال دیتے تھے۔ اس کی شاخوں سے کپڑے کے ٹکڑے باندھ رکھے تھے جو ان منتیں ظاہر کرتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک جناب گوتم بدھ کو اسی درخت کے نیچے ''گیان'' حاصل ہوا تھا۔

گوتم بدھ کے پیروکار انہیں خوشبو، روشنی (دیے) اور پھولوں سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

دن بھر کی آوارہ گردی سے بھوک خوب چمک اٹھی تھی، رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ جانے حلال ملے گا یا نہیں۔ البتہ اللہ کا شکر ہے کہ اس پورے قیام میں حلال کھانا قریباً ہر جگہ با آسانی دستیاب تھا۔

۲ ستمبر ۲۰۱۰ء

آج کی رات ہم نے کینڈی میں گزارنی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ ایک شہر سے دوسرے کے بیچ میں جو تفریحی مقامات آئیں گے وہ دیکھتے ہوئے آگے چلتے جائیں گے۔

سب سے پہلے ہم پناّ والا کے ہاتھیوں کے یتیم خانہ (اس کا نام Elephants orphanage تھا۔) میں رُکے۔ یہ جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک جوہڑ نما تالاب سا تھا جس میں ہاتھی لیٹے تھے۔ پیچھے کی طرف جنگل سا تھا جہاں ہاتھی رہتے تھے۔ دراصل اسے ہاتھی کی سیر کرنے کی جگہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا مہاوت اسے ایک اونچی جگہ کے پاس لا

کھڑا کرتا اور بیچارہ سیاح سوار ہو جاتا۔ ہاتھی کے اوپر کوئی سیٹ نہیں تھی۔ وہ قد میں بھی کچھ اتنے لمبے نہیں تھے۔ کالے رنگ کے تھے۔ پیارے نہیں لگ رہے تھے۔ سب اس کی کھال پر ہی سوار ہو رہے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھ جیسے ڈرپوک لوگوں کے لئے وہ اس پر کمبل ڈال دیتے تھے ورنہ ہم دروازے سے ہی واپس لوٹ جاتے۔ اس پر سوار ہو کر یہ سوچ رہی تھی کہ بھلا ''یہ'' راجہ کی سواری ہے۔ بہت ہی چبھتا ہے۔ میں تو کسی کو بھی اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔ بادشاہ ہی بیٹھیں۔ تخت کی سختی بھی تو ہر کسی سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ شاہی سواری بھی انہی کو مبارک!

اب کہ ہم چلے تو چائے کی فیکٹری کے پاس جا کر رُکے۔ اندر داخل ہوئے تو ہر طرف پتی کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بھاری بھرکم مشینوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ چائے کے پودے سے اوپر والے صرف تین پتے چن لئے جاتے ہیں۔ ان پتوں کو دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ پھر وہ مختلف مشینوں میں پیسے جاتے ہیں۔ اس پینے کی مقدار سے مختلف قسم کی پتی بن جاتی ہے۔ پھر اسے بھی مزید سکھا لیتے ہیں اور وہ پینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فیکٹری والوں کے بقول تمام چائے بنانے والی کمپنیاں یہی پتی خریدتی ہیں اور پھر اپنے برانڈ کے نام سے بازار میں لا کر بیچ دیتی ہیں۔ یہاں کی ۹۷ فیصد پتی برآمد کی جاتی ہے۔

ہم ایک شہر سے گزرے جس میں کاجو کثرت سے اُگتے ہیں۔ اس کا نام ہی ''کاجوگاما'' تھا۔ یہ ان کے اُگنے کا موسم نہیں تھا۔ البتہ ہم نے اس کا درخت دیکھ لیا۔ سڑک کے کنارے عورتیں اپنی ٹوکریاں لئے بیٹھی، کاجو بیچ رہی تھیں۔ وہیں ہم نے اس کے درخت کی تصویر دیکھی جو ہاتھ سے دیوار پر بنائی گئی تھی۔ کاجو کا پھل سبز اور پھر پک کر لال رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کے نیچے اس کی گٹھلی نکلی ہوتی ہے۔ اس کو توڑیں تو اندر سے کاجو نکلتا ہے۔ ایسی ایک گٹھلی ہمیں انہوں نے تحفہ کے طور پر دی اور ساتھ ہی خبردار کیا کہ یہ چھلکا زہریلا ہے، منہ میں مت ڈال لیجے گا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ پیرا دیلنیا کے Botanical gardens تھے۔ گیٹ کے باہر لوگ مصالحہ جات فروخت کر رہے تھے۔ یہ بھی اس زرخیز خطے کی ایک اور برآمد کی جانے والی پیداوار ہے۔ اندر داخل ہوئے تو تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ دونوں طرف اونچے گھنے درخت تھے۔ اتنے گھنے کہ زمین تک سورج کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔ درختوں کے موٹے تنوں پہ ان کے نام اور جس جگہ پر اگتے ہیں، ان کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی درخت چین کا، جمیکا کا تھا اور کوئی فلپائن، ویسٹ انڈیز کا۔ یہ دیکھ دیکھ کر حیرانگی ہو رہی تھی کہ دنیا کے کونے کونے میں بکھری اقسام ایک جگہ اکٹھی کیسے کی گئی ہوں گی؟ پودوں نے مٹی قبول کیسے کر لی؟ کسی نے اکٹھے کئے ہوں گے یا خود رو ہوں گے؟ کتنے ہی سالوں سے یہ اُگ رہے ہوں گے؟ بالآخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ یہ انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔ مالک نے جس پیڑ کو جہاں حکم دیا، وہ وہیں سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

وہاں ہم نے نت نئی شکلوں کے پودے دیکھے۔ کسی کے پتے نارنجی رنگ کے تھے تو کسی کے سرخ، کسی کے جامنی تو کسی کے بھورے۔ کچھ پتوں پر سبز اور پیلا سا ڈیزائن تھا۔ کسی

پودے پر بنانے والے نے پتے یوں لگائے تھے کہ پھول کی شکل بن گئی تھی۔ بڑے، چھوٹے، لمبے، پتلے، موٹے ہر طرح کے پتے دیکھنے کو ملے۔ خالق کی صناعی دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

انتظامیہ نے پودوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک نرسری بھی بنا رکھی تھی۔ اس میں گملوں میں پودے سجائے رکھے تھے۔

کینڈی پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہوٹل ڈھونڈا، سامان رکھا اور سری لنکا کے سب سے بڑے مندر Temple of the tooth کو دیکھنے نکل پڑے۔ ہمارے رہنما یشانتے نے بتایا کہ اس کے اندر لارڈ بدھا کا دانت رکھا ہے۔ عام طور پر اسے لوگوں کو نہیں دکھاتے۔ جب بارش نہ ہوتی ہو تو اسے نکالتے ہیں اور رحمت برسنے لگتی ہے سچ ہے کہ اللہ بندے کی توقع کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس دانت سے امید لگا کر مانگتا ہے تو اللہ بھی مایوس نہیں کرتا...... ڈھیل دیتا جاتا ہے۔ غلط عقیدہ مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس عظیم الشان مندر کے دروازے پر ہی ہمیں روک دیا گیا۔ اندر داخل ہونے کا ادب تھا کہ سر ننگا ہونا چاہیے۔ سو ہم الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ مندر کے ساتھ ہی ایک جھیل تھی۔ اس کے کنارے چہل قدمی کرتے میری نظر دور پہاڑ پر بیٹھے بدھا پر پڑی یہ غالباً شہر کی سب سے اونچی جگہ تھی، بدھا کا سفید رنگ کا دیو قامت بت اپنے مخصوص انداز میں چوکڑی مارے، اپنی آنکھیں آدھی کھولے بیٹھا تھا۔ یہیں بدھ مت کے بھکشو بھی دیکھے اورنج رنگ کی ساڑھی (گاندھی کا لباس) اور استرے والی ٹنڈ سے ہر جگہ پہچانے جاتے ہیں۔

۳ ستمبر ۲۰۱۰ء۔

آج ہم نے نورایلیا پہنچنا تھا۔ یشانتے نے بتایا کہ وہاں سردی ہو گی۔ ہم نے احتیاطاً گرم کپڑے نکال لئے۔ آج کا دن ان سب دنوں میں سب سے اچھا تھا۔ جو کچھ ہم نے دیکھا، وہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے، بیان میں لانا ممکن نہیں ہے۔

سارا راستہ آبشاروں سے بھرا پڑا تھا۔ صاف ستھرا، ٹھنڈا یخ پانی بلندی سے شور مچاتا گرتا ہے تو سفید رنگ کا لگتا ہے۔ یقیناً پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ پہاڑ سے گرتا ہے تو پورے پہاڑ پر یوں کاٹ پڑ جاتی ہے کہ مشینوں سے تراشا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اللہ میاں بہت خوبصورت ہیں۔

ہم چائے کے کھیت دیکھنے کے لئے رُکے۔ کھیت میں اتر کر کھڑے ہوئے تو چاروں طرف چائے کے پودے نظر آتے ہیں۔ سب ایک ہی قد کے لگتے ہیں۔ ان میں سیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ اسے کاٹنے کے موسم میں عورتیں اپنے پیچھے کپڑے کی جھولیاں سی باندھے اوپر والے پتے چنتی ہیں۔

پہاڑوں کے دامن میں خوبصورت جھیل دیکھ کر ہم نے گاڑی رکوالی۔ ایک بار پھر ہم پیڈل بوٹ میں سوار ہو گئے۔ موسم ابر آلود تھا بلکہ بادل ہماری پہنچ میں تھے۔ جھیل کے تین طرف سبزہ اور گھاس تھی۔ ایک سمت گھر بنے ہوئے تھے۔ کوئی جزیرہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ بادل اتنے زیادہ تھے کہ یکدم آتے اور ہمیں آگے کچھ نظر آتا نہ پیچھے۔ دھند کی طرح لگ رہے تھے۔ پتہ چل رہا تھا کہ بادل چل رہے ہیں۔ کسی فلم کی طرح بیٹھے بیٹھے سوچا کہ کتنا مزہ آئے اگر بادلوں کا پردہ ہٹے تو کسی اور ہی

جگہ پہنچے ہوں......یا برمودہ تکون کی طرح غائب......

تقریباً ایک گھنٹہ ہم اس پرسکون ٹھنڈ میں بیٹھے رہے۔ خاموشی، سردی، بادل، پانی اور سبزہ......کشتی ہوا کے رخ پر چل رہی تھی۔ پانی میں بنتی لہروں سے شبہ ہونے لگا تھا کہ پانی بہہ رہا ہے۔ بہر حال، مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اترتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ افطاری میں باقی دو، ڈیڑھ گھنٹہ کیسے گزاریں۔ سامنے ہی ایشانتا کھڑا، اپنی قومی خوبی سے مجبور، ہمیں دیکھ کر فراخ دلی سے مسکرا رہا تھا۔ درحقیقت وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ ایشانتا نے تو ہمیں بھی یہ انکشاف کر کے بےحد خوش کر دیا کہ روزہ کھلنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میاں صاحب کی گھڑی کچھ زیادہ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ روزہ دار کو افطار کے وقت ملنے والی خوشی اللہ میاں نے بڑھا چڑھا کر دی تھی۔ وہیں پر موجود واحد کھانے کی جگہ سے کھانا لیا۔ اندر ہیٹر لگے ہوئے تھے مگر ہم نے باہر کی سردی اور سکون میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ کھانا بھی انتہائی لذیذ تھا یا لگ رہا تھا۔ کھا پی کر واپس ہو لئے۔ کہیں رات کو سونے سے پہلے میاں کو خیال آیا کہ خوشی کے مارے یہ تو دریافت ہی نہ کیا کہ کھانا حلال بھی ہے؟ ساری رات یہی سوچتے گزری کہ شاید حرام تھا، اس لئے زیادہ مزے کا لگ رہا تھا۔ اللہ کا کرنا، اگلے دن وہاں سے گزر ہوا۔ گاڑی رکوا کر پتہ کروایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ حلال تھا۔

راستے میں بازار میں رُک کر یہاں کے خاص بڑے ناریل(king coconut) کا جوس پیا۔ یہ ناریل باہر سے ہلکے براؤن رنگ کا تھا۔ اس پر بال نہیں تھے۔ اندر سے پانی کا بھرا تھا stra ڈال کر پیا۔ اندر سے کھوکھلا تھا، کھوپرا نہیں تھا۔ صرف ملائی کی طرح کا سفید رنگ کا مادہ تھا جو ذائقے میں کھوپڑے کے مشابہ تھا۔

۴ ستمبر ۲۰۱۰ء

ہمارے آج کے منصوبے کے مطابق ہم نے ''اڈّاوالو اولے نیشنل پارک'' دیکھنا تھا تقریباً چار سے پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد عصر کے قریب وہاں پہنچے۔ یہ ایک قسم کا سفاری پارک تھا۔ اندر جانے کے لئے پیچھے سے کھلا (چھت کے بغیر) ٹرک کرایہ پر لینا پڑا۔ البتہ اس پر بیٹھ کر کچے راستے کے ''جھولے'' لینے یا جھٹکے کھانے کا بہت مزا آیا۔ یہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا جنگل نما تھا۔ اندر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی جانور نظر آ جاتا تھا۔ وہاں مور، مگرمچھ، ہرن، گائے، بھینسے اور سب سے زیادہ تعداد میں ہاتھی نظر آئے۔ ایک چھوٹا ہاتھی اکیلا گھوم رہا تھا۔ گاڑی قریب جانے پر ڈر کر چھپ گیا ایک بڑے ہاتھی سے چند قدم کے فاصلے پر ہم گاڑی روک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی شاید عادی ہو گیا تھا۔ ہمیں بالکل نظر انداز کر کے اپنے پاؤں سے گھاس اکھیڑ کر کھاتا ہوا گزر گیا۔

زیادہ تر ہاتھی اکٹھے ہی تھے۔ سب کے سب اپنے پاؤں زمین پر رگڑ رگڑ کر گھاس اکھاڑتے، اسے جھاڑتے اور سونڈ سے پکڑ کر منہ میں ڈال لیتے۔ ہمارے ساتھی نے بتایا کہ ہاتھی دوپہر میں پانچ سے چھ گھنٹے سوتا ہے اور دن کا باقی حصہ کھاتے ہوئے گزارتا ہے۔ اس شخص کے پاس ہاتھیوں سے متعلق تفصیلی معلومات تھیں۔

ہم زیادہ وقت چیتے ڈھونڈتے رہے لیکن شکر ہے اللہ کا

کہ کسی سے سامنا نہیں ہوسکا۔ واپس گاڑی میں آ کر بیٹھے، پھر سے سفر شروع ہوا اور بالآخر ''رتنا پورا'' پہنچ کر دم لیا۔

۵ ستمبر ۲۰۱۰ء

رتنا پورا اپنے قیمتی پتھروں کی کانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ سو ہم نے بھی کان کی سیر کرنے کی ٹھانی۔ اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک کان کھلی مل گئی۔ اس کو اس کے مالک کے نام سے ''راجا مدالالی'' (راجا۔ مالک) کی کان کہتے ہیں۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے ہی تھے کہ ہمیں لے جانے کے لئے کھڑے وہاں کے بوڑھے مزدور نے مجھے دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا۔ یہ جان کہ افسوس ہوا کہ عورتیں وہاں نیچے نہیں جاسکتیں۔ سو میاں صاحب نے مجھے گاڑی میں واپس بھیجا اور رخصت ہو گئے۔

یہ واحد ایسی جگہ تھی جہاں پردیسیوں کو دیسی لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یشا نتے کے بقول مقامی آدمی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ بھی بہت پرجوش تھا کہ آپ کے ساتھ مجھے بھی جانے دیں گے۔

صفائی پسند طبیعت کا حامل بندہ، آدھے پونے گھنٹے کے بعد واپس لوٹا تو کپڑے کیچڑ اور ریت سے لت پت تھے۔ بیٹھتے ہی توبہ کی کہ آئندہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ تجربہ کافی خوفناک بلکہ خطرناک تھا۔ عورت کے وہاں جانے کا تو واقعتاً سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کان ۱۵۰ (ایک سو پچاس) فٹ گہری تھی۔ ایک ربڑ کے پائپ کو پکڑ کر لکڑی کے پھٹوں پر پاؤں جما کر نیچے اترتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بلب کی روشنی میں تین کان کن کدال سے دیواریں کھودنے میں لگے ہیں۔ جو مٹی اور پتھر نکلتے تھے انہیں بوریوں میں بھر بھر کر اوپر لے جاتے۔ ان بوریوں کو پانی کے ایک ٹینک میں خالی کر دیتے ان کے پاس بانس کی بنی ہوئی چھابہ نما بڑی ٹوکریاں تھیں۔ ان کو وہ ٹینک میں ڈال کر نکالتے تو پانی چھن جاتا اور اس میں چھوٹے بڑے پتھر اور ریت رہ جاتی۔ پھر ان سینکڑوں پتھروں کو جو ایک ہی بار میں اس ٹوکری میں آ جاتے تھے، اپنی جوہر شناس نظروں سے پرکھتے اور پھر تیلے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے چنتے چلے جاتے۔ ان میں کچھ پتھر بے کار تھے، کچھ کم قیمت اور کچھ نایاب!

ان پتھروں کو کاٹا، تراشا اور پھر چمکایا جاتا ہے۔ اس صنعت کا سب سے بڑا مرکز ''کوگلہ'' شہر ہے۔ یہاں انہیں جڑاؤ کے لئے موزوں شکل دی جاتی ہے۔ پھر انہیں دیدہ زیب زیورات میں استعمال کیا جاتا ہے۔

میاں صاحب کے بقول کان کے اندر سیدھا کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ میں وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کسی لمحے اوپر سے مٹی کا تودہ گرے اور میں گزر جاؤں تو باہر بیٹھی میری بیوی کا کیا بنے گا؟......

اس نئی زندگی ملنے پر اللہ تعالیٰ کا دلی شکر ادا کرتے ہوئے ہم سنگھاراجہ کے جنگل (singharaja rain forest) پہنچ گئے۔

یہ تو واقعی سچ مچ کا جنگل تھا۔ بس اس کے باہر ٹکٹ بوتھ لگا دیا تھا۔ کسی پہاڑی راستے کی طرح گول چڑھائی تھی۔ غالباً 15 کلومیٹر تھی (ہم شاید مشکل سے 4 کلومیٹر تک گئے ہوں گے) پہاڑ پر چڑھنا، وہ بھی پیدل، کوئی بچوں کا کھیل نہیں

ہے۔ہم نے جنگلی پودے دیکھے۔چھوئی موئی کو چھو کر دیکھا۔ بہت پیارا تھا۔اس کے چھوٹے چھوٹے پتے انگلی پاس لے جانے پر ہی سمٹ کر بند ہو جاتے تھے۔ پھر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ واپس کھل جاتے تھے ۔ ایک اور دلچسپ پودا **pitcher plant** تھا یہ گھڑے کی شکل کا پودا تھا۔دیوار پہ اُگے ہوئے تھے۔گھڑے کا ڈھکن کھلا تھا۔جب کوئی قسمت کا مارا کیڑا، پتنگا اس پر بیٹھتا تو وہ ڈھکن بند کر لیتا اور تازہ گوشت کے مزے لیتا۔وہاں دار چینی کے درخت سے دار چینی توڑی۔ یہ اس کی چھال سے حاصل کی جاتی ہے۔ربڑ کے درخت کی چھال چیریں تو سفید مادہ نکلتا ہے۔لچک والا ہوتا ہے، یہی ربڑ ہے۔**fern** کے پودے کثرت سے اگے ہوئے تھے۔میٹرک میں اس کے رٹے لگانے کی وجہ سے بہت اپنائیت محسوس ہوئی ۔

جانوروں میں اصلی **viper** سانپ نظر آیا۔سبز رنگ کا تھا اور پتوں میں چھپا ہوا،مشکل سے ہی نظر آتا تھا۔بہت لمبا تھا ۔ہمیں دیکھ کر ڈر کر چھپ گیا حالانکہ میں بھی بہت ڈری ہوئی تھی ۔چھپکلی کی طرح ،مگر لمبی ، بہت ٹانگوں والی گو نے بھی ہمارا راستے کاٹا ۔اس کے علاوہ گرگٹ کو بھی رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔

یہاں بھی مزا آیا ، وہی قدرتی خاموشی اور سکون...... دوسرے لفظوں میں...... حسنِ بے پروا کی بے نقابی...... جی بھر کر دیدار کیا۔

آج کا سفر بہت لمبا تھا۔راستے میں یہاں کی سو سالہ قدیم مسجد میں رکے۔عشاء کی اذان ہو رہی تھی ۔لوگ بہت خوش ہوئے۔انتہائی ملنسار تھے۔عورتوں کی طرف تو میں اکیلی ہی تھی ۔اس پر ہمارے بزرگ میزبان پریشان تھے اور بار بار میاں صاحب سے پوچھتے رہے کہ میں اکیلی ہوں تو ڈر تو نہیں جاؤں گی؟

سلام پھیرتے ہی وہاں کے نمازیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔سب باری باری ملتے رہے اور سوال کرتے رہے ۔میں نے اپنے آپ کو ان مسلمانوں کا بہت ہی ممنون پایا۔ان کی وجہ سے ہی وہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ''مسلمان جھوٹ نہیں بولے گا۔'' ہمارے لئے تو پیشانی ہی قوم کا نمائندہ تھا اور اس کے یہی الفاظ تھے۔

ہاں ،مسجد بڑی اور پرانی تھی ۔ میرے لئے وہاں کی عجیب چیز پانی کا بڑا سا حوض تھا۔سب اسی سے وضو کر رہے تھے ۔اندر لوٹے رکھے تھے اور بظاہر نکاسی کا انتظام بھی تھا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ اسی حوض میں چند مچھلیاں بھی تیر رہی تھیں۔

سری لنکا میں مسلم اکثریتی علاقے بآسانی پہچانے جاتے ہیں۔زیادہ تر مرد سروں پر ٹوپیاں رکھے ہوتے ہیں اور عورتیں برقعے میں لپٹی نظر آتی ہیں۔

آج رات ہم ''پکاڈوا'' پہنچ گئے۔

۶ ستمبر ۲۰۱۰ء

آج ہمارا یہاں آخری دن ہے۔ہم نے ساحل کے ساتھ ساتھ واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے کولمبو پہنچنا ہے ۔ راستے میں آنے والی ،نقشہ پر نشان زدہ جگہیں دیکھتے جائیں گے۔

"dutch fort" کا بہت چرچا سنا تھا۔ سمندر کے کنارے اونچی اور طویل فصیل تھی۔ قلعہ نہیں تھا بلکہ پہرے داروں کے گشت کرنے کا راستہ تھا۔ سمندر سے تقریباً 20-25 فٹ اونچا تھا۔ وہاں کچھ سر پھرے نوجوان اس اونچائی سے سمندر میں چھلانگ لگانے کے مظاہرے کر کے روزی کما رہے تھے۔

اس کے پاس ہی مسجد کی ایک سفید عمارت تھی۔ اس کا نقشہ اطالوی شخص کا بنایا ہوا تھا۔ اسی لئے دیکھنے میں کلیسا سے مشابہ تھی۔ یہ 17 ویں صدی میں بنائی گئی تھی اس کے فرش پر ایسی ٹائلیں لگائی گئی ہیں جو اسے ٹھنڈا رکھتی ہیں۔ اس کا نام "مسجد الخیرات" تھا۔

پھر ہم موٹر بوٹ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرنے گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ کشتی کے تختے میں موٹے شیشے کا ٹکرا جڑا ہوا تھا۔ اس سے ہم اپنے نیچے تیرتی مچھلیاں بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ البتہ یہ رنگ برنگی چھوٹی بڑی مچھلیاں، کچھوے اور سمندری پودے پانی میں بنظرِ راست بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کشتی والے نے ہمیں گہرے پانی میں لے جانے سے گریز کیا کیونکہ اس کے بقول اس موسم میں سمندر کشتی قبول نہیں کرتا۔

اس کے ریتلے ساحل پر چھوٹی چھوٹی سیپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک سیپی چلتی ہوئی دیکھ کر اس کے پاس ہوئی تو وہ یکدم دبک کر بیٹھ گئی۔ مجھے بے انتہا حیرت ہوئی کہ یہ اصل میں کیڑے ہیں جو اپنا گھر اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ جب کیڑا مر جاتا ہے تو اس کا سخت اوپر کا حصہ باقی رہ جاتا ہے۔

ہم وہیں نرم، گرم، کپڑوں اور جسم سے چپکتی ہوئی ریت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر پیاری اور پوری سیپیاں ڈھونڈنے لگے۔ اتنے خوبصورت رنگ تھے اور زیادہ تر میں دو، تین رنگوں کا شاندار ملاپ تھا۔ خوشی، جوش، حیرت اور بچپنے سے نہال ہو رہے تھے۔ واقعی رب کی رب ہی جانے!!

تبھی وہاں کا ایک مقامی آدمی اپنے کندھے پر بڑا سا بستہ ڈالے، ہمیں سیپیاں بیچنے چلا آیا۔ اس نے ہماری محنت اور مشقت کو "سمندر کا کچرا" کہا۔ وہ گہرے پانیوں میں غوطہ زنی سے ڈھونڈ کر نکالی ہوئی اصلی سیپیاں بلکہ سیپ نکال نکال کر دکھانے لگا۔ ان کی جسامت، انتہائی موزوں ہیت اور ساخت دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے۔ اس نے مزید بتایا کہ ہم انہیں ان کے کیڑے سمیت نکال لاتے ہیں۔ پھر اس میں نلکے کا پانی ڈالتے ہیں تو کیڑا باہر نکل آتا ہے۔

پھر ہم کسکوڈا کے کچھوے پالنے والے فارم پر گئے۔ یہ کافی معلوماتی دورہ تھا۔ کچھوے کی زندگی کا پورا دور ہمارے سامنے تھا۔

کچھوے کی مادہ، سینکڑوں کی تعداد میں، ساحل پر آ کر انڈے دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ مزید ذمہ نہیں اٹھاتی۔ یہ انڈے آبی جانوروں یا انسانوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔ ان کی نسل کی افزائش کے لئے حکومت لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ ان انڈوں کو (turtles hatchery) میں لایا جائے۔ انہیں اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

ان انڈوں کو ریت کے ڈھیر کے نیچے دبا دیا جاتا ہے۔ ان سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پانی کے ٹینک میں ڈال دیتے ہیں۔ تین سے چار دن گزر جانے پر ان کا خول زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ انہیں پانی سے نکالیں تو سمندر کی خوشبو

سونگھ کراس تک پہنچ جاتے ہیں۔

وہاں پر صرف اندھے، لنگڑے یا کسی معذوری کے حامل کچھوے رکھے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ مادہ کچھووں کی رہائش اور پرورش کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے۔

ہمارا یہاں کا آخری روزہ گاڑی میں ، بازار میں کھلا ۔میاں صاحب گرم گرم، چھوٹی چھوٹی، گول گول پکوڑوں جیسی کوئی چیز لائے۔ بہت خستہ اور لذیذ تھی۔ یشانتا نے بتایا کہ یہ ''وڑے'' کہلاتے ہیں۔ہم نے اس سے ترکیب پوچھی۔اس بھلے مانس نے اسی وقت اپنی بیوی سے فون کر کے پوچھا اور ہمیں لکھوادی اس میں صرف ماش کی دال (پسی ہوئی) گھول کر تل لی جاتی ہے۔سبز مرچ اور نمک کے علاوہ کوئی مصالحے بھی نہیں ڈالتے۔گھر پہنچتے ہی پہلی افطاری پر سب کو''وڑے'' کھلائے۔

ائیر پورٹ کے چیک ان کاؤنٹرز پر بہت پیارے پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ قدرتی مناظر کے سامنے وہاں کے ہنستے مسکراتے لوگوں کی تصاویر تھیں ۔ نیچے لکھا تھا''یہ مسکراہٹیں مت بھولنا!!''(Remember the smiles) بہت اچھا لگا تھا۔ واقعی یہ پیارا سا ملک اور یہاں کے ہشاش بشاش لوگ ہمیشہ یاد رہیں گے۔

☆☆☆

شب جائے کہ من بودم......

"یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے!"

شہر نبیؐ قریب آ رہا ہے......خوشی اور ندامت کے آنسو آنکھوں سے رواں ہیں۔فضا کا رنگ بدلتا جا رہا ہے، ذہن کے پردے پر تاریخ کے ورق پلٹتے چلے جا رہے ہیں، گناہ گاروں کی زبان پر درود شریف کا ورد جاری ہے، آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے، ہوا نرمی، محبت اور لطافت لئے ہوئے ہے، اچانک رحمتِ خداوندی برسنے لگی، اور رم جھم بارش کے قطرے روح کو بھی اندر تک سیراب کر گئے، ان فضاؤں میں رچی بسی سدا بہار خوشبو دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے۔

یہ مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین ہے، یہ حرم ہے، احترام و ادب کا مقام...... جھکاؤ نظریں، بچھاؤ پلکیں......

۲، رمضان المبارک، مدینۃ النبیؐ کی سہانی فضاء، مسجد نبویؐ کا ٹھنڈا فرش، روضۂ رسولؐ کے عین سامنے گنبدِ خضرا پر نظریں جمائے......انتظار کی حالت میں محوِ خیال ہوں، گروپ کی خواتین کے درمیان ایک باوقار سی خاتون پریشانی کے عالم میں کھڑی ہیں، بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کر رہی ہیں۔میں نے فاطمہ کو ایک طرف کیا خود بھی سمٹ گئی اور انہیں اشارے سے بلا لیا۔میرے قریب بیٹھ کر بہت مشکور ہوئیں اور مہذب، تعلیم یافتہ انداز سے میرا تعارف لیا۔کہنے لگیں "میں انڈیا سے آئی ہوں تم کبھی انڈیا گئی ہو"۔ان کے خالصتاً اردو لب و لہجہ میں "تم" کہنے سے مجھے خرمؒ مراد صاحب یاد آئے۔ان کے "تم" کہنے کا انداز بھی ایسا ہی تھا جس سے وقار ٹپکتا تھا۔ابھی پاکستان واپسی پر ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے انتقال کی خبر سن کر مجھے ۲ رمضان المبارک مسجد نبویؐ میں گنبد خضرا کے عین سامنے ان باوقار خاتون سے اپنی ملاقات یاد آ گئی ہے۔...... میں نے کہا، انڈیا جانے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔میرے پوچھنے پر کہ انڈیا میں مسلمانوں کے حالات کیسے ہیں، کہنے لگیں۔پاکستان کے مسلمانوں سے کافی بہتر ہیں۔ایمان کی آزمائش سخت حالات میں ہو تو ایمان بڑھ جاتا ہے بس انڈیا میں مسلمان اپنی اسلامی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔مجھے خاصی شرمندگی ہوئی۔پھر وہ پوچھنے لگیں، تم ڈاکٹر محمود احمد غازی کو جانتی ہو؟

میں نے کہا بالکل۔انہیں کون نہیں جانتا۔کہنے لگیں، وہ میرا بھانجا ہے اور میں اس کی خالہ۔دو دن پہلے ہی وہ مدینہ منورہ سے پاکستان لوٹے ہیں اس دفعہ میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

بہت محبت تھی ان کے لہجے میں، مقدس سی خاموشی چھا گئی۔ہم پھر درود شریف کا ورد کرنے لگے۔ذہن و قلب کو اضطراب و ندامت، محبت و شفقت، ملے جلے جذبات نے حصار میں لے رکھا تھا۔وہاں تعلیم تربیت و تزکیہ کے لئے معلمات کا انداز دیکھ کر مجھے لگا کہ حقیقتاً یہ وہی مقصد ہے جس

کے لئے خود نبیؐ تشریف لائے تھے ۔ آس پاس بیٹھی سیدھی سادھی خواتین جو محبت کے جذبے سے سرشار ضرور ہیں لیکن اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقوں اور روایات پر چلنے کو ہی درست دین سمجھتی ہیں ۔انہیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہم وہی کریں جو ہمارے نبیؐ کو پسند تھا اور جس کا ہمارے نبیؐ نے حکم دیا اور اس کام سے رک جائیں جو ہمارے نبیؐ کو نا پسند تھا ۔ یہی حقیقی محبت ہے ۔ مسجد نبویؐ کے اس سازگار ماحول میں ایسی بنیادی تعلیمات سکھانے سے قبولیت کے اثرات چہروں پر جلد دکھائی دینے لگتے ہیں ۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ اجازت مل گئی اور حاضری کا وقت آن پہنچا۔ اک عالم بے خودی میں ہر فرد اپنے ہی وجود کو سنبھالے آگے بڑھتا گیا۔ قدموں پر کوئی اختیار تھا نہ دل پر۔ میں نے فاطمہ کا بازو تھام لیا اور خالہ ڈاکٹر محمود احمدؒ نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ وہ کب مجھ سے الگ ہوئیں کب آگے بڑھ گئیں مجھے پتہ نہ چلا۔ پچھلی دفعہ حاضری کے موقع پر فاطمہ، سمیہ، خولہ تینوں میرے ساتھ تھیں...... نگرانی پر متعین معلّمہ نے میرا ہاتھ تھام کر بچیوں سمیت مجھے سبز قالین پر لے جا کر کھڑا کر دیا ۔ میری آنکھوں سے جھڑیاں لگی تھیں اور مجھے ادراک نہ تھا کہ میں نفل کی ادائیگی کے بعد ہاتھ اٹھائے رب سے کیا مانگ رہی ہوں ۔ اس دفعہ بھی فاطمہ کو تھامے خالی نظریں لئے حیران پریشان میں سنہری جالیوں کے سامنے کھڑی تھی...... میرا اندرونی وجود میرے ظاہری وجود سے الگ ہو چکا تھا ۔ میں حال میں موجود نہ تھی ۔ میرے قدم تھم سے گئے اور سانسیں بھی...... بوجھل قدموں اور جھکی نگاہوں سے میں سبز قالین پر جا کھڑی ہوئی ہاتھ اُٹھے ہیں مگر حرفِ دعا یاد نہیں ۔ مدہوشی کے عالم میں چند ہی الفاظ تھے جو ٹوٹے پھوٹے میری اپنی سماعت تک بمشکل پہنچ پائے تھے ۔ یا رسولؐ اللہ یہ مسلمان ...... یا رسولؐ اللہ پاکستان ...... یا رسولؐ اللہ عالم اسلام ...... یا رسولؐ اللہ ہم اُمتی ...... سیلاب ، طوفان ، آگ ، دھماکے ، سازشیں ...... یا رسولؐ اللہ ہم شرمندہ ہیں ...... یا رسولؐ اللہ ہم کہاں جائیں ۔کیا کریں ...... ہمارے اپنے اعمال ۔ یا رسولؐ اللہ ...... ہم تیرے حضور...... ندامت زدہ دکھتا ہوا دل لے کر حاضر ہیں ۔ یا اللہ ہم پر رحم کر دے، ہمیں عافیت دے دے!

کچھ دیر نظروں سے دل میں وہ منظر اتارا۔ دھڑ کتے دل پانی سے بھری آنکھیں اور گھسیٹتے ہوئے قدم لیکر میں اور فاطمہ واپسی کے رستے پر ہو لئے ۔ مسجد کے ایک ستون سے کمر ٹکائے بیٹھ گئی ۔ صبح کا وقت تھا، صفائی کا عملہ اپنے کام میں مگن تھا، خواتین کی محدود تعداد ہال میں موجود تھی ۔ میں نے نظریں جھکا لیں، ذہن ابھی بھی خالی تھا ۔ یہ مصری، یہ ترکی، پاکستانی، انڈین، انڈونیشیا، سعودی عرب...... حاضری سے واپس آنے والی خواتین کے قدم بڑھتے اور باہر کی طرف جاتے دیکھتی رہی ، طرح طرح کے لباس اور متنوع بولیاں ، قدر مشترک ایک...... حبِّ رسول ﷺ ...... کیا یہ جذبہ اس قدر مضبوط نہیں ہو سکتا کہ ہماری زندگیاں بدل ڈالے ۔ حرم کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہی ہم یہ سارا خزانہ حرم ہی میں کیوں چھوڑ آتے ہیں ۔ یہاں حدود حرم میں ...... بالخصوص مسجد کے احاطے میں اپنا وجود اس قدر لطیف اور ہلکا پھلکا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا کے تمام بوجھ سر سے اتر گئے ہوں، سکون واطمینان کی خوشگوار

کیفیت احاطہ کئے رکھتی ہے۔لگتا ہے روح جسم سے آزاد ہوکر مسجد کی عمارت میں تیرتی پھر رہی ہے۔کبھی یہاں کبھی وہاں، صلوۃ سلام، دعائیں، تلاوت قرآن کی آوازیں، دعوت وتبلیغ کی صدائیں سنتی ہوئی، ستونوں میں سے گزرتی ہوئی......جوں ہی مسجد سے نکل کر قیام گاہ کی جانب چلیں تو روح دوبارہ جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔ مجھے رات تراویح میں اپنے پہلو میں بیٹھی وہ ہندوستانی خاتون بھی بہت یاد آتی ہیں جو اپنی بیٹی کے پاس آئی ہوئی تھیں۔وتر کے دوران امام صاحب کی رقت آمیز دعا کے بعد واپسی کے لئے جانے سے پہلے میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے اور بچوں کے لئے دعا کا کہا تو یکدم وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور بار بار ایک ہی جملہ دہراتی ہیں۔''بیٹی۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں یہاں کیا کہنا ہے، کیسے کہنا ہے...... مجھے کچھ معلوم نہیں'' میرے پاس ان کو تسلی دینے کے لئے کوئی الفاظ نہ تھے...... یہاں تو سب ایک ہی حال میں دامن دل چاک کئے خالی جھولی پھیلائے خیر لینے کے منتظر ہیں۔ میں ان کا کندھا تھپتھپاتی رہی اور وہ بچوں کی طرح سسکتی رہیں۔

ہم کمزور ایمان والے، خطا کار ہی سہی، لیکن راکھ میں دبی وہ چنگاری ہیں جو اس وقت بھڑک کر جل اٹھتی ہے اور دشمن کو جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے جب اس کے محبوب نبیؐ رحمتوں والے نبیؐ پر کوئی انگلی اٹھاتا ہے۔ یہ عشقِ رسولؐ ہے...... یہ انتہائے محبت ہے!

میں مسجد کے ہال میں ستون سے ٹیک لگائے انہی خیالوں میں گم بیٹھی ہوں۔قریب ہی ایک مصری نوجوان لڑکی بہت خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کے آخری پارے کی آخری سورتیں تلاوت کر رہی ہے کچھ ہی دیر بعد میری سماعت سے ایک یقین بھری آواز ٹکراتی ہے۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

کامل یقین کے ساتھ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

میری زبان بھی یہی آیت دہرانے لگتی ہے۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

☆☆☆

آپ کی ساس آپ کی محسن

اب بہو کے لئے آخر میں چند جملے......شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات! آپ سوچیں

اگر شادی ہی نہ ہوتی ، اب تک کسی اچھے رشتے کے انتظار میں دن گزر رہے ہوتے......تو کیا ہوتا؟

یہ تو اس کا کرم ہے کہ اتنا اچھا رشتہ مل گیا، شادی ہوگئی۔ محبت ملی، گھر ملا، اتنے نئے نئے رشتے ملے، آپ کسی کی بہو، بیوی، امی، ممانی، تائی، چچی، بن گئیں اب ایک نئے ماحول میں کچھ تبدیلیوں کو قبول کرنا تو لازمی ہے۔ سگے دو بھائیوں کے گھر کا ماحول بھی فرق ہو جاتا ہے۔

یہ جو آپ کی ساس ہے یہ وہ خاتون ہے جو در حقیقت آپ کی محسن ہے، جسے اب کوئی دشمن نمبر ایک سمجھ لیتا ہے۔ یہ تو سرا سر نادانی ہے۔ اس معزز خاتون نے بڑی مشکلوں سے تکلیف اٹھا کر اس بیٹے کو جنم دیا اس کی پرورش میں اپنی نیند ،خوراک، جوانی، طاقت صرف کر دی۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر آپ کو پسند کر کے دلار سے بیاہ کر لائی، غور کریں یہ اس کا جرم ہے یا لطف و مہربانی بلکہ احسان ہے؟ اپنا بیٹا آپکے حوالے کر دیا اپنے گھر کی رانی بنا دیا اور خود کو محدود کر لیا اس گھر میں اسکا خون پسینہ، وقت اور محنت صرف ہوئی تھی گھر کوئی ایک دن میں تھوڑی بن جاتے ہیں۔

؎ بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

اس ننھے سے پودے کو اپنے خون سے سینچا اپنا دودھ پلایا، بیماری میں خبر گیری کی، سکول کے لئے تیار کیا، دین سکھایا، آداب اور رشتوں کی پہچان کرنا سکھائی ۔ جب یہ تن آور درخت بنا تو آپکے حوالے کر دیا اب اسکا سایہ پھل دونوں آپ کھائیں اور خود وہ آپکے اشارے کی منتظر کہ وہ بھی ان نعمتوں سے فیض یاب ہو سکے۔

ذرا عدل سے کام لیں۔ آپ کا بھی بیٹا ہے، کل آپ کی بہو آئیگی۔ جیسا سلوک آپ پسند کرتی ہیں وہی سلوک اس عمر رسیدہ ماں سے کیجئے کیونکہ یہ نیکی آپ کی طرف پلٹ کر آئیگی۔

سوچیں انہوں نے کتنے دن اور زندہ رہنا ہے ان کے پاس زندگی کی متاع آپ کی نسبت بہت تھوڑی رہ گئی ہے ان کی خدمت کر کے دعائیں لیں اور اپنی دنیا کو جنت بنا لیں۔

وہ تنقید کریں تو جواب نہ دیں، غصہ آجائے تو معاف کر دیں ۔اعتراض کر بیٹھیں تو انکے سفید بالوں کا لحاظ کر لیں، صبر کر لیں ۔ادب سے بات کریں۔ کیونکہ آپ کے بچے دیکھ رہے ہیں سیکھ رہے ہیں کل کو وہ بھی آپ کے ساتھ وہی سلوک کرینگے جو آپ کو کرتا ہوا دیکھیں گے۔

یہ ایک سلسلہ ہے جو نسل در نسل چلتا رہتا رہے گا بس کردار بدل جاتے ہیں ہماری جگہ نئے لوگ نئے کردار آجاتے

ہیں جیسے سٹیج پر ڈراما ہوتا ہے۔

''یہ دنیا کھیل تماشا ہے مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا اور فخر جتانا جیسے زمین کی نباتات جب وہ ہری ہوگئی تو کسانوں کو خوش کرتی ہے پھر زرد ہوگئی اور بھس بنکر ہوا میں اڑتی پھرتی ہے آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا بہت ہی قلیل ہے'' (القران)

اس آیت میں دنیا کی زندگی کی ساری حقیقت کھول کر رکھ دی گئی ہے ایسی فانی اور بے وزن چیز کے لئے کیا پریشان ہونا، کیا لڑائیاں جھگڑے مول لینے، اللہ کے لئے صبر کریں اور معاف کردیں وہ خود ہی راستے کھول دے گا آسانیاں پیدا کرے گا اور آپ کے دل پر سکون نازل کرے گا آپ یہ سمجھ لیں کہ وہ آپ کی ''ماں'' ہیں بس ان سے ویسا ہی سلوک کریں، اپنے اعمال نامے کو نیک عمل سے مزین کریں یہ دنیا اور آخرت میں آپ کے کام آئے گا۔ عمل کریں تو فائدہ ہوگا ورنہ

؎ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

نئی شادی شدہ لڑکیاں جب میرے کلینک میں آتی ہیں تو اُن کا ایک سوال ہوتا ہے کہ ہمارے شوہر تو ماں کی ہر بات مانتے ہیں ان کو قابو کرنے کا کوئی نسخہ بتائیں۔

وہ راز یہ ہے کہ آپ اپنے شوہر کی ماں سے دوستی کرلیں پکی دوست بنالیں سارے مسائل حل ہو جائیں گے ۔ شوہر آپ کا دیوانہ بلکہ پروانہ بن جائے گا۔ آزما کر دیکھئے!

۞۞۞

کچن کارنر

ملائی کوفتہ کری

اجزاء: قیمہ ایک پاؤ، آلو پانچ عدد، پنیر 100 گرام، ہری مرچیں 2 عدد، کارن فلور ایک چوتھائی کپ، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ 1/3 چائے کا چمچہ، سرخ مرچ ½ چائے کا چمچہ، دھنیا پسا ہوا ½ چائے کا چمچہ، کھویا نصف کپ، بالائی نصف کپ، لہسن ادرک کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچہ، کشمش ¼ کپ، خشخاش (پسی ہوئی) 2 کھانے کے چمچے بھنے ہوئے چنے پسے ہوئے 2 کھانے کے چمچے گرم مصالحہ پسا ہوا۔ ایک چائے کا چمچہ، ہرا دھنیا 2 کھانے کے چمچے، ایک عدد درمیانی پیاز اور دو ٹماٹروں کو ابال کر پیسٹ بنالیں۔

ترکیب: ابلے ہوئے آلو اور قیمہ ہاتھوں سے یکجان کر لیں۔ اب ان میں کارن فلور، کالی مرچ نمک، خشخاش اور چنے کا آٹا ملا کر پھر سے یکجان کر لیں اور ایک انڈہ بھی ڈال کر مکس کر دیں تا کہ کوفتے خستہ رہیں اور ٹوٹیں نہ۔ اب تھوڑا سا آمیزہ ہتھیلی پر رکھ کر پیڑا سا بنائیں اور اسکے درمیان میں تھوڑی کشمش ڈال کر بند کریں اور کوفتے کی شکل دے لیں۔ اسی طرح سے سارے کوفتے بنائیں اور انہیں ڈیپ فرائی کر کے ایک ڈش میں رکھتی جائیں۔

گریوی بنانے کی ترکیب: دوسری طرف ایک کڑاہی یا بڑے فرائی پین میں آئل گرم کریں اس میں پہلے لہسن ادرک کا پیسٹ ڈالیں اور پھر پیاز ٹماٹر کا پیسٹ ڈال کر ذرا سا براؤن کر یں اور نمک، لال مرچ، دھنیا پاؤڈر اور کٹی ہوئی ہری مرچیں ڈال کر بھونیں۔ اب کھوئے کو دو کپ پانی میں خوب کچل کر مکس کریں پھر بھونیں۔ پنیر ڈالیں اور ذرا بھونیں جب گریوی پکنے لگے تو بالائی اور گرم مصالحہ ڈالیں اور یہ گریوی کوفتوں کے اُوپر ڈال دیں، چاہیں تو کوفتے اس میں ڈال دیں اور ایک منٹ کا دم لگا لیں۔ ہرے دھنیے سے سجائیں اور گرم گرم چپاتی یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

پالک اور میتھی گوشت

اجزاء: گوشت ایک کلو، ہری میتھی 250 گرام، پالک 250 گرام، ٹماٹر چار عدد(درمیانے) کٹے ہوئے، سرخ مرچ ایک چائے کا چمچہ، نمک ایک چائے کا چمچہ، ہری مرچیں چار سے پانچ عدد کٹی ہوئی، ادرک لہسن کا پیسٹ 2 چائے کے چمچے، پنیر (کدوکش کیا ہوا) 2 کھانے کے چمچے، بالائی 2 کھانے کے چمچے، دودھ آدھا کپ، پیاز (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد، گرم مصالحہ پسا ہوا ایک چائے کا چمچہ۔

ترکیب: (نوٹ: اگر یہ ڈش مٹی کی ہانڈی میں پکائیں تو لطف دوبالا ہوگا) باریک کٹی ہوئی پیاز کو گھی میں براؤن کر لیں

پھر لہسن ادرک کا پیسٹ ڈالیں اور ایک منٹ کے بعد ٹماٹر اور بقیہ مصالحے (سوائے گرم مصالحے کے) ڈال کر اسے بھونیں ۔ جب گھی اور مصالحہ الگ ہونے لگے تو اس میں بالائی ڈالیں اور ساتھ ہی گوشت ڈال کر بھونیں ۔ پانچ منٹ تک دودھ کا چھینٹا دیکر بھونتی جائیں ۔ اب گوشت میں 2 پیالی پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو نے لگے تو اس میں میتھی اور پالک جو آپ نے الگ سے اُبال کر رکھا ہوا ہے سبز مرچ ڈال کر اسے ہلکا سا گرائنڈ کر لیں اور گوشت میں ڈال کر خوب بھونیں ۔ یکجان ہو جائے اور مصالحہ خوشبو دینے لگے تو اُتار کر ڈش میں نکال لیں اب اس پر پسا ہوا گرم مصالحہ چھڑکیں اور کدو کش کیا ہوا پنیر ڈال کر گرم گرم پیش کریں ۔ اُبلے ہوئے چاولوں یا چپاتیوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

خشخاش بھرے پراٹھے

اجزاء: خشخاش ایک پاؤ، آٹا آدھا کلو، پیاز اگر ہرا پیاز ہو تو دو اور اگر خشک ہو تو ایک درمیانہ، نمک ایک چائے کا چمچہ، سرخ مرچ ایک چائے کا چمچہ، ثابت دھنیا ½ چائے کا چمچہ (ذرا سا کوٹ لیں) زیرہ سفید 1/3 چائے کا چمچہ (ذرا سا کوٹ لیں) آمچور ½ چائے کا چمچہ، ہرا دھنیا ہری مرچ کٹی ہوئی حسب پسند۔

ترکیب: خشخاش کو اچھی طرح سے دھو کر مٹی نکال دیں اور سل پر باریک پیس لیں ۔ پیاز بھی اسی کے ساتھ پیس لیں اب اس میں نمک، سرخ مرچ اور بقیہ مصالحے ڈال کر حل کر لیں ۔ آٹے کو گوندھ لیں اور اس میں گوندھتے وقت 2 چمچے گھی کے ڈال دیں اور حسب پسند نرم یا سخت گوندھ لیں اور پیڑے بنا لیں ۔ اسی طرح سے خشخاش کے پیڑے بنا لیں ۔ ایک پیڑا آٹے کا ہاتھ پر رکھیں اور اس میں خشخاش کا پیڑا رکھ کر دبائیں اور چاروں طرف سے آٹے میں چھپا دیں اب اس پیڑے کو احتیاط سے بیلتی جائیں بیلتے وقت روٹی پر تھوڑا سا گھی لگائیں اور سوکھا آٹا چھڑک دیں ۔ پھر بیلیں اور توے پر ڈال دیں ۔ درمیانی آنچ پر دونوں طرف گھی لگا کر خوب سنہرا تل لیں ۔ ان پراٹھوں کو ٹماٹر اور پودینے کی مزیدار چٹنی یا دہی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں ۔

(عزہ عثمان)

چنے کی دال کا حلوہ

اجزاء: چنے کی دال آدھا کلو، گھی 2 کپ، چینی 2 کپ، سبز الائچی 10 عدد، دودھ 1 کلو، بادام پستہ، اخروٹ، حسب پسند، زعفران 1/4 چائے کا چمچہ، کھویا 100 گرام، ناریل 1 کپ۔

ترکیب: دال کو دودھ میں 2 گھنٹے کے لئے بھگو دیں پھر اسی دودھ میں ابال لیں جب دال گل جائے تو نکال کر پیس لیں پھر دوبارہ اسی دودھ میں پسی ہوئی دال اور کھویا ڈال کر دودھ خشک کر لیں دیگچی میں گھی ڈال کر کڑکڑائیں اس میں سبز الائچی اور ناریل ڈال کر بھون لیں بھوننے کے درمیان اس میں دال اور ساتھ ہی چینی ڈال دیں جب اچھی طرح بھن جائے تو چولہے سے اتار کر ٹرے میں پھیلا دیں اور اس پر بادام، پستہ، زعفران پھیلا کر اوپر سے اچھی طرح دبا دیں حلوہ تیار ہے ٹکڑوں کی صورت میں کاٹ لیں اور چائے کے ساتھ پیش

کریں۔

کھجور کا حلوہ

اجزاء: کھجور 1 کلو، گھی یا تیل 1 کپ، دودھ آدھا کلو، کشمش آدھا کپ، ناریل 1 پاؤ، بادام کٹے ہوئے آدھا پاؤ۔

ترکیب: سب سے پہلے کھجوروں کی گٹھلیاں نکال دیں پھر دیگچی میں دودھ اور کھجوریں ڈال کر ابال لیں۔ ڈھکن بند کر کے ابالیں اور وقفے وقفے سے ہلاتی رہیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے اور کھجور نرم ہو جائے تو گھی ڈال کر خوب فرائی کریں۔ جب گھی چھوڑنے لگے تو ناریل لمبے کاٹ کر ڈال دیں اور ساتھ بادام اور کشمش بھی ڈالیں اور آہستگی کے ساتھ چمچ سے مکس کریں پھر کسی برتن میں نکال کر چاندی کے ورق لگائیں چاہے گرم گرم نوش فرمائیں یا پھر ٹرے میں پھیلا کر ٹھنڈا کر لیں اور مختلف سائز میں کاٹ لیں یہ بڑوں اور بچوں کے لئے بہت مقوی غذا ہے بچوں کو دودھ کے ساتھ دو تین چمچ دیا کریں اس سے ذہن بھی تیز ہوتا ہے۔

(شازیہ مشتاق)

محشر خیال

فرزانہ چیمہ۔لاہور

ماہنامہ ''چمنِ بتول'' ہر ماہ نویں نکور ٹائٹل کے ساتھ......
خوبصورت مضامین اور نثری وشعری مواد کے ہمراہ نظر افروز ہوتا ہے۔محشرِ خیال میں حاضری کی تحریک اس ماہ کے اداریے نے دی۔ایک زوردار انداز بیان کے ساتھ موجودہ حالات پر ہر سنجیدہ وفہمیدہ پاکستانی کی ایسی عمدہ ترجمانی...... ایسا فی البد یہہ انداز...... جلے دل کی ایسی سوزش...... میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہےکے مصداق ہر قاری کے یہی جذبات واحساسات ہیں، پہلے تو ہم مظلوم ومقہور اہل کشمیر کے لئے یہ دعا کیا کرتے ہیں اب وہی دعا ہم اپنے لئے کرتے ہیں۔

؎ شب یہ غلامی کی کردے کافور یااللہ

اب کے 23 مارچ کس عالم میں......کن حالات میں آیا ہے؟ قوم کو بے وقوف بنا کر......ریمنڈ ڈیوس کو اچن چیت مگر چوری چھپے بھگا کر...... پھر خطاب کرنے کا شوق چراتا ہے مگر خطاب میں کیا تھا؟ وہی بات کہ سٹوری ہی سٹوری ہے کہانی تو ہے ہی نہیں۔ادھر قاتل، جاسوس اور نہ جانے کس کس جرم کا حامل مگر حاکم صاحب کے معزز فرد کو عزت واحترام سے امریکہ واپس بھیجا اُدھر اللہ قادر مطلق کے کلام مجید، فرقانِ حمید کے ساتھ ان بدبختوں کا یہ سلوک کہ قلم کو لکھنے کا یارا نہیں اور آنکھوں کو پڑھنے کا...... زبان کو دہرانے کا حوصلہ نہیں اور ہم نے صرف مذمتی قراردادیں پیش کر کے دین سے......اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت، غیرت اور حمیت کا ثبوت دے دیا۔چہ خوب!

ڈرون حملے جاری ہیں۔کراچی میں روزانہ ہدفی قتل کا بازار گرم ہے۔مہنگائی دھریک کے درخت کی طرح قد نکالتی ہی جارہی ہے اور دوسری طرف کرپشن کی ایسی الف لیلوی داستانیں اخبارات میں آرہی ہیں کہ جہاں جہاں کسی کو اقتدار نصیب ہوا ہے کروڑوں سمیٹ لے گیا ہے۔گویا اٹ پٹوتے کرپشن نکل آتی ہے...... یہ حال ہے ہمارے اس خطۂ پاک کا جسے کس قدر جذبوں سے، ولولوں سے، شہادتوں سے ہندو اور انگریز سے لڑائی کر کے لیا گیا تھا۔

؎ اس کا چپہ چپہ میرے واسطے ہے محترم
خونِ مسلم سے ہے لالہ رنگ ہر گامِ وطن

بات بتول اور اس کے خوبصورت اداریے کی ہورہی تھی ...... اداریہ یوں بھی اچھا لگا کہ اب کی دفعہ ایک مدت بعد قارئین سے پرچے کے بارے میں بھی باتیں کی گئی ہیں۔کبھی کبھار اس طرح قارئین سے بات چیت آپس میں رابطے اور یگانگت کا کام دیتی ہے۔

ڈاکٹر افتخار برنی، ڈاکٹر رخسانہ جبیں اور ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کے مضامین خاصے کے ہیں (بہن رخسانہ جبیں کا مضمون تو

اخبارات میں بھی دینا چاہیے) گویا اس دفعہ ڈاکٹر چھا گئے۔ ادھر ڈاکٹر نزہت اکرام نے ''طوفان کہاں سے اٹھتا ہے' دردو سوز کی کیفیت میں ایسی نغمگی کے ساتھ حالِ دل بلکہ ہر اہل دل کا حال دل نظم کیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ طارق محمود طارق صاحب ہمیشہ اچھی شاعری کرتے ہیں ، مجموعۂ کلام کب آ رہا ہے؟ افسانوں میں قانتہ رابعہ کا افسانہ بہترین رہا۔ انہوں نے جس مرض کی نشاندہی کی ہے وہ بہت عام ہوتا جا رہا ہے البتہ عنوان مناسب نہیں لگا یہ کسی مضمون کا عنوان تو ہوسکتا ہے افسانے کا نہیں۔ ''مسکراہٹیں'' بہت خوب ہیں ذرہ وہ انہیں تلاش کرنے میں کافی مطالعہ اور محنت کرتی ہوں گی مسکراہٹیں تو آج کل کم یاب ہوتی جا رہی ہیں، رفیعہ نسیم پاشا کی چند یادیں گو مختصر تھیں مگر خوب تھیں انہیں لکھتے رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی (پھر ڈاکٹر) کا مضمون اللہ کرے بہت ساری سخت ساسوں کو اچھی ساس بنا جائے، عتیق الرحمٰن قریشی صاحب کا مضمون اچھا تھا ہمیں تو آپا جی بنت الاسلام کی ایک خوبصورت کتاب ''غم نہ کر'' کی یاد دلا گیا۔

''آمد رسولؐ'' ام عبد منیب کی خوبصورت منظوم تخلیق ہے مگر یہ فروری میں شائع ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا کہ بارہ ربیع الاول گزشتہ ماہ کی 16 فروری کو تھا اور بتول کے اندرونی ٹائٹل پر عربی مہینہ مارچ کے پرچے میں ربیع الاول لکھا ہے جبکہ ربیع الثانی یکم مارچ سے صرف پانچ ، چھ روز پیچھے ہے اس طرح ربیع الثانی لکھنا چاہیے تھا......فروری ، مارچ دونوں ماہ کے اداریے ربیع الاول کے حوالے سے خاموش رہے اور ہاں شمیم فاطمہ کا انشائیہ خوب تھا۔ کاٹ دار اور تبسم ریز......آسیہ راشد

اور نوشابہ احسن کی آمد بھی باعث مسرت ہوئی امید ہے آئندہ بھی صفحاتِ بتول میں ان سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ ویسے تو یہ اپنے گرائیں ہیں ملاقات ہوتی رہی ہے۔ ملاقات نہیں ہوتی یا برسوں بعد ہوتی ہے تو ان عزیزوں سے جو بیرون ملک جا بسے ہیں چونکہ ڈاک کی شرح میں بہت اضافہ ہو چکا ہے لہٰذا محشر خیال کے ذریعے ہی دریارِ غیر میں مقیم اپنی بہت پیاری اور عزیز دوستوں مثلاً سعودیہ کی فرحانہ احمد، شارجہ کی ڈاکٹر بشریٰ تسنیم، کینیڈا کی ام صفی، آسٹریلیا میں ڈاکٹر شگفتہ نقوی اور دیگر کو ایک دل خوش کن خبر پہنچے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نانی کے رتبے پر سرفراز کر دیا ہے۔ جی ہاں! ماریہ عمر کو اللہ رحمان ورحیم نے ایک پیاری سی بیٹی سے نوازا ہے۔ رب رحیم زینب عمر کو دنیا وآخرت کی بھلائیوں سے نوازے۔ آمین

☆ آپ کو اس خوشی پر ادارے کی جانب سے بھی مبارک باد !(مدیرہ)

شمیم فاطمہ۔ کراچی

ہم تو سمجھے تھے کہ رات گئی بات گئی۔ ویلنٹائن ڈے گزر گیا، اس سے متعلق تحریر بھی گزر گئی ہوگی (جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا!) مگر مارچ میں اسکا انتخاب کر کے آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ (جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیارہ جائے گا!) آپ کسی تحریر کی حق تلفی نہیں کرتیں اور یہ بات جمہوری عمل کا حصہ ہے۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے (بتول میں شائع ہو گئی تو مقام پا گئی ورنہ ڈسٹ بن میں خاک میں لتھڑی ہوئی، گرد میں نہلائی ہوئی پڑی ہوتی)

قانتہ (کسی دن معنی بنا دیجئے گا) نے قارئین کی آرا کا گلہ کیا ہے جس میں وہ حق بجانب ہیں، ہوتا یہ ہے کہ ادھر اُدھر میں خط اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ بتول کے مندرجات پر بات ہی نہیں ہو پاتی لیکن آپ یقین رکھیے کہ آپ کی ہر تحریر نہ صرف مجھے بلکہ ہر کسی کو پسند آتی ہے۔ ''میری لائبریری سے'' میں جو معلومات آپ فراہم کرتی ہیں وہ بھی کارِ خیر ہے اور افسانے کے موضوعات بھی منفرد ہوتے ہیں، پڑھنے والا کچھ سیکھتا ہی ہے اظہارِ رائے کرے یا نہ کرے آپ نے ''خدیجہؓ تیری عظمت کو سلام'' لکھ کر نہ صرف اس عظیم ہستی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ تمام خواتین کو یہ پیغام دیا ہے کہ شریک حیات کا مطلب یہ نہیں کہ ہر وقت رونا رویا جائے بلکہ حضرت خدیجہؓ کی زندگی سے آئیڈیل شریکِ حیات کے اوصاف چنیں تا کہ زندگی قفس کی بجائے آشیانہ بن سکے۔

ارشاد عرشی کی نظم ''میرے بچو'' نے میدان مار لیا۔ ایک ایک لفظ دل کو لگا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ ہر ماں کو چاہیے کہ اس نظم کو فریم کر کے اپنے بیڈروم میں لگا دے تا کہ آتے جاتے بچے اس پر نظر ڈالتے رہیں (کچھ نہ کچھ تو یاد ہی رہے گا)

ڈاکٹر نزہت کی خدمت میں ہمارا سلام! اللہ ان کو ایمان وصحت کے ساتھ زندگی عنایت کرے (آمین) اس صورت حال میں جو ہم پاکستانیوں کو لاحق ہے، مزید کیا بات کی جائے! عجیب ایک بے بسی اور بے چارگی محسوس ہوتی ہے کہ اس ملک میں شہریوں کی جان و مال، عزت آبرو کو تو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے مگر ایک قاتل کو سرکاری تحفظ حاصل ہے!

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

ہمیشہ کی طرح ماشاء اللہ پورا ہی شمارہ فروری بہت خوب تھا لیکن بشریٰ تسنیم کی تحریر ''بارش کے بعد'' نے تو بہتوں کے ایمان کو تازہ کر دیا ''ذرا جو تم ٹھہر جاتے'' بھی رلا دینے والی تحریر تھی لیکن ''قیامت کو ملیں گے'' اصلاح معاشرہ کے لئے بڑی کارگر تحریر ہے اچھے بھلے سمجھدار لوگ بھی ایسے موقعوں پر صبر و استقامت سے کام لینے اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرنے کی بجائے خود بھی اس رو میں بہہ جانے کو خوبی سمجھتے ہیں۔ ابو اسامہ صاحب نے لکھا ہے کہ شاید ہماری طرح کا کوئی سماجی بندھنوں میں جکڑا انسان راہ راست پر آ جائے۔

''ایمان بچائے رکھنا'' طاہرہ فرحت صاحبہ نے حقیقت پر مبنی تحریر لکھی میری اپنی ایک جاننے والی ہیں جن کے پاس اچھے بھلے لوگ غیب کی خبریں پوچھنے آ جا رہے ہیں جبکہ دوسروں کو مستقبل کی خبریں دینے والی کو خود پتہ نہیں چلتا کہ اس کے اپنے بچے کا مستقبل کیا ہوگا۔ کون سا پھول، سبق، اتنی سی بات، احساس یہ سارے افسانے زندگی کے بہترین تجربات کا نچوڑ ہیں آدابِ میزبانی، بڑھاپا اور ہم بہترین رہنما تحریریں ہیں کچن کارنر مفید ہے خاص مضمون حقیقت میں خاص مضمون ہی ہے نوریہ کا تبصرہ اور ریڈلے کے تاثرات بہت متاثر کن ہیں خصوصاً ایوان ریڈلے کا یہ کہنا کہ زندگی میں خرابی اور پریشانی لوگوں کی مذہب سے دوری کی بنا پر ہے مسلم ممالک کو مغرب کی اچھی باتیں ضرور اپنانی چاہیں جن میں سر فہرست تعلیم کا فروغ، شخصی آزادی کا احترام، ہر فرد کو صحت اور علاج معالجے کی بہترین سہولیات کی فراہمی، معاشرتی نظم و

ضبط اور میرٹ کی بالا دستی جیسے اصول مسلم معاشرے کی ترقی کا باعث بن سکتے ہیں جن کا اسلام بھی تقاضا کرتا ہے۔

ہما جبین فیصل۔جدّہ

کافی عرصے بعد بتول میں مختصرِ خیال میں لکھنے کا موقع ملا ہے کچھ اس طرح کے حالات رہے کہ سفر درپیش رہا، ذہنی یکسوئی اور اطمینانِ قلب لکھنے کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے، شکر ہے اس ربِ کریم کا جس نے دوبارہ وہ سکون نصیب فرمایا ۔دورانِ سفر اور قیام کے دوران بھی بتول باقاعدگی سے مجھ تک پہنچتا رہا، بتول کی کئی تحریروں کو پڑھ کر اپنے آپ میں تبدیلی محسوس کی ہے بلکہ اور لوگوں تک بھی متعارف کروا کے ان کو اصلاحی ادب سے رغبت دلانے کی کوشش تاحال جاری ہے۔

بتول کی تحریروں پر تبصرہ ہم خیال دوستوں اور بہنوں سے ہمیشہ ہوتا رہتا ہے اور خواتین کے کئی طرح کے رسالے زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ایک بات میں نے اور میری دوستوں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ بتول کے کچھ نامور لکھنے والے اپنی تحریریں جلد یا بدیر ایک ساتھ کئی جگہوں پر بھیج رہے ہیں۔میں کسی خاص لکھنے والے کا نام نہیں لوں گی بلکہ اس تحریر کے ذریعے میری ان تمام لکھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ ایسا نہ کریں، پڑھنے والوں کو کوفت ہوتی ہے۔

ہم چونکہ سعودیہ میں قیام پذیر ہیں تو یہاں پرچہ کچھ اس طرح ملتا ہے کہ ہم رواں مہینے کے پرچے پر تبصرہ نہیں کر پاتے پھر بھی الحمدللہ پرچہ مل جاتا ہے اور اچھی تحریروں سے محروم نہیں رہتے ’’اتنی سی بات‘‘ بہت عمدہ لگی، پلو میں باندھ لی۔’’میری امی ‘‘میں سمجھ نہیں آیا کیا مقصد تھا لکھنے کا، تحریر تھوڑی طویل ہوتی تو شاید کھل کر خیال سامنے آتا صائمہ نورین کی غزل بہت اچھی لگی ’’سلگتا بلوچستان‘‘ نے دل کو دکھی کر دیا میر بابر مشتاق کے مضمون نے ایک بار پھر مسلمان عورت ہونے پر شکر اور فخر کا احساس دلایا۔طاہرہ فرحت کے کالم نے بیک وقت ہنسایا بھی اور ایمان کے بارے میں فکرمندی کی تحریک بھی دلائی۔ڈاکٹر شگفتہ نقوی کی تحریر خود بھی غور سے پڑھی اور اپنی پیاری امی جان کو بھی پڑھوانے کا سامان کیا۔خفتگانِ خاک نے موت یاد دلا دی۔ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے اس سے عمل میں تیزی اور وقت کی کمی کا احساس رہتا ہے ذروہ نے ہمیشہ کی طرح خوب ہنسایا، چلتے چلتے نے اشعار کے ذخیرے میں اچھا اضافہ کیا، فرزانہ سے بالمشافہ ملاقات کی خواہش زیادہ ہوگئی آپ سب لکھنے والوں سے درخواست ہے کہ جب جدہ آنا ہو تو ہم سے ضرور رابطہ کریں میں اپنا ای میل ایڈریس صائمہ اسما کے پاس نوٹ کروا رہی ہوں ۔ مجھ سے ضرور رابطہ کریں ۔ بتول میں شائع شدہ احادیث الحمدللہ آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں آئندہ تبصرے تک کے لئے اجازت۔دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

عشرت لطافت۔کراچی

پہلی دفعہ آپ کے رسالے میں شرکت کی جسارت کر رہی ہوں گو کہ میری دو کاوشیں ’’میری چاہت‘‘ اور ’’حمد یہ کلام‘‘ آپ کی حوصلہ افزائی سے اس رسالے میں جگہ پا چکی ہیں جس کے لئے میں بے حد ممنون ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اب کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں، آپ کا رسالہ ماشاءاللہ

بہت معیاری اور صاف ستھرے پُر اثر مضامین کا امین ہے۔ اس کی تحریریں ہماری روایات اور تہذیب کی عکاس ہیں اور ان کا حسنِ خیال دل میں اتر جاتا ہے، خاص طور سے دین کے بارے میں خوبصورت تحریریں اس رسالے کا حسن اور ہمارے شعور کی آ گاہی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ دعا ہے اللہ پاک اس رسالے کو ہر پڑھنے والے کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنادے۔ آمین

غوثیہ بنت ارسلان۔کھوٹہ

آپ کا اداریہ بہت سی معلومات دے جاتا ہے ورنہ ہم اتنے اخبار کہاں سے پڑھ سکتے ہیں سارے کا سارا رسالہ معلومات سے پُر ہوتا ہے۔ دینی اور دنیاوی آ گاہی پہنچانے پر بہت بہت شکریہ۔ بتول کے افسانے بھی بہت دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ خاص کر قانتہ رابعہ اور ڈاکٹر نزہت اکرام کے افسانے دل کو چھو لیتے ہیں، ڈاکٹر نزہت نے ''کونسا پھول'' میں دونوں بہنوں کی نفسیات بڑی حکمت سے دکھائی ہیں ڈاکٹر نزہت نے کرکٹ کا پرانا ریکارڈ بھی افسانے میں شامل کر کے ایک افسوسناک حقیقت یاد دلائی ہے اب کے تو شکر ہے اچھا کھیل رہے ہیں اللہ پاکستان کی عزت رکھے۔آمین

فرزانہ چیمہ کا چلتے چلتے ہنساتا بھی ہے اور قوم کی بے بسی پر رلاتا بھی ہے پیروں اور پیرنیوں پر اعتبار کرنے والی عورتوں کے لئے طاہرہ فرحت نے بڑی اچھی مثالیں پیش کی ہیں اللہ سب کا ایمان بچائے رکھے۔

نعتیں، نظمیں، غزلیں بھی بہترین ہیں راحت چغتائی کا ایک شعر تو بہت عمدہ ہے سب کو پسند آیا

انہیں مصلوب کرنا ہے تو کر لو !
یہ دیوانوں کے سر ہیں خم نہ ہونگے۔

میں جب بھی لاہور آتی ہوں بتول کے کافی سارے شمارے لیکر جاتی ہوں پھر ہم سب سہیلیاں اور بہنیں پڑھتی ہیں ۔اللہ آپ سب کو بہت اجر دیں کہ آپ علم پھیلا رہی ہیں۔

اُم عثمان۔سیالکوٹ

مارچ کا بتول نظر نواز ہوا قانتہ Again شکریہ!

حضرت خدیجہؓ کے بارے میں افسانہ بے حد خوبصورت اور اثر انگیز ہے۔

عتیق الرحمٰن کا ''پریشانی اور اس کا تدارک'' بہت اچھا مضمون ہے۔اسی سلسلے کی ایک آڈیو کیسٹ بھی مارکیٹ میں موجود ہے۔

''اچھی ساس بنئے'' میں بے چاری ساس صاحبات کے لئے بہت اچھے مشورے موجود ہیں۔ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ساسوں کو وہ اعلیٰ درجہ کا صبر عطا فرمائے جو ان تمام مشوروں پر عمل کرنے کے لئے پہلی سیڑھی کا درجہ رکھتا ہے۔

لکھاری بہنوں سے گزارش ہے کہ اب کوئی نیک دل ''جوانی کس طرح گزاری جائے بھی لکھ ڈالے جس میں آج کی بے لگام بہوؤں کو لگام پہنانے کے کچھ قواعد وضوابط موجود ہوں۔

شاعری میں ''میرے بچو'' بہت اچھی لگی اور دل چاہا کہ اسے سنبھال کر رکھ لوں اور جب میرے بچے پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو انہیں پڑھواؤں۔

راحت چغتائی صاحب کی غزل بھی اچھی لگی خصوصاً یہ شعر بہت پیارا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو شیرازہ ہستی بکھر جائے
ذرا دیکھو تو دھڑکن دل کی مدھم ہو تی جاتی ہے

رخشندہ نوید، ام عبدمنیب، طارق محمود اور نزہت اکرام صاحبہ سبھی نے بہت اچھا لکھا ہے خاص طو پر ڈاکٹر نزہت اکرام کا یہ شعر بہت اچھا لگا۔

ہیں عریاں منظر ہو شربا ، یہ قوم ہوئی کتنی رسوا!
اس دھیمی دھیمی آنچ پہ دل دیوانہ جلتا بجھتا ہے

ڈاکٹر رخسانہ جبیں کا مضمون ''مشترکہ لائحہ عمل کی ضرورت ہے'' اگر چہ آخر میں پڑھا ہے مگر پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ اسے پڑھنا کتنا ضروری تھا۔ڈاکٹر صاحبہ آپ کے مشورے آپ کے خلوص اور جذبات کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں ، اللہ ہم سب کو ان پر عمل کی توفیق دے (آمین)

سعدیہ شفیق۔گوجرانوالہ

اللہ آپ کے شمارے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور آپ سمیت بتول کی پوری ٹیم کو اجرِ عظیم سے نوازے(آمین)

بتول اور نور کے ہم اس وقت سے قاری ہیں جب ہم بہن بھائی 3rd،4rd کلاس کے سٹوڈنٹ ہوا کرتے تھے اور آج ہمارے بچے بھی اس کے پڑھنے والوں میں ہیں ۔ رفاقت تو بہت پرانی ہے مگر لکھنے کا اتفاق کم ہی ہوا۔اس وقت آپ کے ساتھ ایک بات،ایک احساس جو مجھے ہمہ وقت اپنے گھیرے میں لیے رہتا ہے شیئر کرنا چاہ رہی ہوں مناسب لگے تو بتول میں جگہ دے دیجئے گا۔

رفعت اشتیاق۔گوجرہ

جب قانتہ رابعہ نے اتنے مان سے کہہ دیا کہ کالم پر تبصرہ اُدھار مت رکھیں تو کون بے حس یہ حرکت کرسکتا ہے کہ تبصرہ نہ لکھے۔ بتول تو حساسیت کا ایک ادارہ ہے ۔ پڑھنے والوں کی سوچ کی ترجمانی کتنی خوبصورتی سے کرتا ہے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ میں بھی یہی سوچ رہی تھی میرا دل بھی یہی کہتا ہے ۔ یقین جانیے اتنی مماثلت کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے ۔ قانتہ رابعہ صاحبہ گھر بیٹھے سوڈان کی سیر کروانے کا شکریہ ۔عمر عبداللہ بلکہ بقول مصنفہ مردِ حُر کوئی پاکستان کو بھی عطا ہو تو وارے نیارے ہو جائیں ۔ بطورِ خاص ثریا اسما رقم طراز ہیں '' آج کل میں دو ہی ہستیوں کے درمیان ہوں ۔ایک خدائے واحد اور دوسرا خدائے مجازی، ایک کو رخصت کرتی ہوں تو دوسرے کو یاد کرنے بیٹھ جاتی ہوں اس کی یاد سے فارغ ہوتی ہوں تو پہلے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے ۔ تیسرا کوئی میری زندگی میں نہیں ۔'' ڈاکٹر افتخار برنی نے قانونِ توہین رسالت پر صدیوں کی گواہی اس طرح دی کہ اب کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں رہی ''ایک ماں کا بچوں کے لئے پیغام'' ارشاد عرشی ملک نے کس خوبصورتی سے حقیقت کو اشعار کا روپ دے دیا۔ ''خدیجہ ضیری عظمت کو سلام'' قانتہ رابعہ نے خاص معاشرتی روش کو کس احسن طریقے سے حل کردیا اور بیویوں کو اُس ''صابرانہ رفاقت'' کا درس دیا جو حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ کا طریقہ تھا۔خلل دماغی سے روشن خیالی تک شمیم فاطمہ کا انشایہ سچ

سچ نوجوان نسل کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ باجی فرزانہ جو ہمارے بتول کی شان آن بان ہیں اُن پر بات نہ ہو بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے لکھتی ہیں۔

دیکھ لیجئے باہر والوں کی کرتوتیں! جن کا ہر کام ہمارے ہاں آئیڈیل تصور کیا جاتا ہے قربان جایئے اسلام کے نظام طہارت کے۔ مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ اپنے خورشید کو لحاف میں چھپا کر غیروں کی موم بتی ہاتھ میں لیکر سفرِ حیات طے کرنا چاہتے ہیں۔ درد کسے نہیں ہوتا لیکن جس درد سے فرزانہ چیمہ نے آشنا کیا ہے وہ کوئی اور ہی درد ہے۔ ''ہم سمجھتے ہیں درد جسمانی ہو یا روحانی ...... ہر قسم کے درد کا ایک ہی علاج ہے آنسو...... ندامت کے آنسو......توبہ کے آنسو......توبہ قبول ہو جانے پر ......دعا قبول ہو جانے پر، قلب و روح شگفتہ ہو جانے پر خوشی کے آنسو!

ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ نے ساس بننے سے قبل اچھی ساس بننے کا فن لکھ کر بڑی نوازش کی ہے۔ اس دفعہ کا بتول بہت پیارا تھا۔

❁❁❁

بال سفید ہونا اور جھڑنا

خواتین میں یہ مسئلہ عام ہوتا جارہا ہے۔ چند احتیاطی تدابیر

خواتین میں قبل از وقت بالوں کا سفید ہونا اور تیزی سے جھڑنا اس وقت ایک سنجیدہ مسئلے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اکثر بالوں کی یہ پرابلم اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ ان کو غذائیت پہنچانے والے غدود کا منہ کسی وجہ سے بند ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بالوں کی جڑوں میں خون اور غذا نہیں پہنچ پاتی اور وہ سفید ہو کر جھڑنے لگتے ہیں اس مرض کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ نوکدار کنگھی بالوں کی جلد پر پھیری جائے تو اس کے سخت دندانے سے کوئی نہ کوئی مسام بند ہو کر ناکارہ ہو جاتا ہے اور اس طرح بال اپنی غذائیت اور دورانِ خون کی آکسیجن سے محروم ہو کر کمزور پڑ جاتے ہیں اور جھڑنے لگتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ بالوں پر ہمیشہ کوئی گول دندانوں کی کنگھی نرمی سے پھریں یا نرم برش استعمال کریں اُلجھے بالوں کو بہت آہستگی سے سلجھائیں اس طرح کم از کم بالوں کے غدود صحت مند رہیں گے۔ بالوں کو ہفتے میں ایک بار کسی اچھے ہربل شیمپو سے دھوئیں اور کنڈیشن کریں بہترین اور آسان ترین کنڈیشنر انڈا، دہی وغیرہ ہیں۔ یہ رنگت کے پگمنٹ (pigment) کی بھی حفاظت کرتے ہیں، بال جلد سفید نہیں ہوتے اور کمزور بھی نہیں پڑتے ان سب کے علاوہ بالوں میں ناریل کے تیل کا مساج پابندی سے کریں اگر اس مرض کے شروع میں ہی ناریل کا تیل استعمال کر لیا جائے تو پھر نئے بال جو نکلتے ہیں وہ سیاہ ہوتے ہیں اور بال ٹوٹنا بھی بند ہو جاتے ہیں۔

سر کی جلد پر دانے

یہ بیماری بھی بالوں کے لئے بے حد نقصان دہ ہے اس میں سر کی جلد پر چھوٹے چھوٹے دانے نکل آتے ہیں جن سے سفیدی مائل پانی خارج ہوتا ہے اس کی وجہ سر کا میلا پن ہے۔ یعنی جب کافی عرصے تک بالوں کو نہ دھویا جائے تو سر کی جلد پر میل کی پپڑ جم جاتی ہے۔ جس سے پہلے جلد پر چھوٹے چھوٹے دانے نکلتے ہیں جن میں بے حد خارش ہوتی ہے اور کھجانے سے ان میں پانی نکلنے لگتا ہے جو جلد کے غدودوں کا منہ بند کر کے بالوں کو خون کے ذریعے غذائیت پہنچنے سے روک دیتا ہے، سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں اور سوزش پیدا ہو جاتی ہے۔ بالوں کے غدود سخت ہو جاتے ہیں اور ان پر بھوری یا پیلی رنگت کی پپڑی جم جاتی ہے وہ اکڑتی ہے تو نیچے کی جلد سرخی مائل ہوتی ہے اور اس پر ورم بھی ہوتا ہے ان سب کی بدولت بالوں کی نشوونما بھی رُک جاتی ہے اور وہ بہت کمزور ہو جاتے ہیں اور شدید کھجلی کی بدولت جب مریض سر کھجائے تو دانوں سے دودھیا پانی نکل کر صورت حال مزید خراب کر دیتا ہے اور بال ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس مرض کا علاج نیم حکیم ٹائپ بیوٹیشن وغیرہ ظاہری طور پر کرتے ہیں جس سے یہ ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس مرض پر اگر آپ

قابو پانا چاہتی ہیں تو اپنی غذا کے ذریعے اس پر کنٹرول حاصل کیجئے ۔اس سلسلے میں وٹامن بی اور ڈی والی غذائیں (جیسے سبزیاں اور پھل) فوری فائدہ پہنچاتی ہیں ۔اس کے علاوہ نظام ہضم کو درست کرنے والی دوائیں بھی فائدہ بخش ثابت ہوتی ہیں ۔

بالوں کا بیرونی علاج

اس کے لئے سب سے پہلے بالوں کو صبح اور شام کسی عمدہ قسم کے ہربل شیمپو جیسے نیم کے شیمپو سے دھوئیں پھر انہیں اچھی طرح خشک کریں ۔ان پر زیتون کے تیل کی خوب مالش کریں ۔ خیال رہے کہ ہاتھ ہلکا رکھیں تا کہ جلد پر خراش نہ پڑے ۔ جب چند دن تک ایسا کرنے کے بعد سر کے درد اور جلد کے ورم میں کمی ہو تو دن میں ایک بار نیم گرم پانی سے سر کو دھو کر بالوں کو اچھی طرح خشک کریں اور پھر زیتون کے تیل کی مالش نرمی سے کریں ۔ایسا ہفتے میں دو بار کریں ۔ جب مکمل طور پر صحت یابی حاصل ہو جائے تو بالوں کی زبردست نگہداشت کریں تا کہ یہ مرض دوبارہ نہ ہو کیونکہ اگر ایسا ہو تو گنجے پن کا مرض لاحق ہو جاتا ہے ۔

اسی مرض کے دوران بالوں کو کٹوانا نہیں چاہیے اور نہ ہی ان کا ڈایزائن تبدیل کریں بلکہ بالوں کے ٹھیک ہو جانے پر بھی کم از کم دو مہینے یہ علاج جاری رکھیں ورنہ جلد کی نزاکت کی بدولت یہ مرض دوبارہ جلد ہو سکتا ہے ۔

اعصابی کمزوری کیونکہ دورانِ خون کو ڈسٹرب کر دیتی ہے اس لئے اس کی بدولت بھی بال کمزور ہو کر اپنا رنگ روپ کھو بیٹھتے ہیں بلکہ گرنے لگتے ہیں اس تکلیف میں بالوں کی خالص سرسوں کے تیل سے مالش کرنا بے حد فائدہ مند رہتا ہے ۔اس سے بالوں کی بیرونی چمک اور مضبوطی بھی قائم رہتی ہے اور وہ اندرونی طور پر بھی صحت مند رہتے ہیں اس تیل کے مساج سے دھوپ اور ہوا جڑوں تک پہنچ کر ان کو صحت بخشتے ہیں ۔اس تیل سے بالوں کے مساموں سے چکنائی اور پسینے کی بھی صفائی ہو جاتی ہے اور وہ گھنے اور صحت مند رہتے ہیں جس کی بدولت بالوں کو بھرپور توانائی اور غذائیت ملتی ہے ۔

❁❁❁

اگر میں دارالکفر میں ہوتی تو......

(خالدہ حبیب)

اللہ کے بے شمار احسانات میں سے یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ پاکستان میں ایک مسلم ملک میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوئی اور یہ کہ میں پیدائشی مسلمان ہوں۔ دینِ اسلام کا شعور آنکھ کھولتے ہی ماں باپ کی تربیت نے دیا۔اگرچہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق کافی دیر سے ہوئی لیکن تمام بنیادی ارکان پر عمل پیرا ہونے کا نمونہ اپنے والدین کی عملی زندگی میں دیکھنے کو ہر وقت ملتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اٹھتے بیٹھتے کان میں پڑتا۔الحمدللہ اپنے دین سے اپنے اللہ سے اپنے نبیؐ سے محبت دل کی گہرائیوں میں بسی ہے لیکن اگر ایسے ہوتا کہ میں دارالکفر میں رہنے پر مجبور ہوتی تو......

اگرچہ یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی لیکن بہر حال اللہ اپنے بندے کے ظرف سے باخبر ہے اس پر وہ اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جس کو وہ سمجھتا ہے کہ اٹھالے گا۔اسے پتہ تھا کہ کسی برائی کو ہاتھ سے پکڑ کر روک نہیں سکتی۔ وہ جانتا تھا کہ میری زبان میں وہ اثر نہیں کہ وہ کسی کو برائی سے حقیقتاً روک دے ۔ ہاں صرف دل سے برا جان کر ایمان کے سب سے کمزور درجے پر ہونے پر کڑھتی رہتی۔ جو کہ میں اب بھی صرف کڑھتی رہتی ہوں ۔ ہاں البتہ اپنے معمولات کچھ ایسے ضرور ترتیب دیتی کہ اپنے اللہ سے تعلق کمزور نہ پڑتا دارالکفر میں بھی کہیں بھی چلے جائیں ایسے اسلامک سنٹر ضرور موجود ہیں جو اشاعتِ اسلام کا کام کرتے ہیں ۔ میں کوشش کر کے اس سنٹر سے ضرور منسلک ہو جاتی ۔ وہاں بہت ساری ہم خیال خواتین مل جاتیں ۔ جہاں ہم قرآن ایک دوسرے کو سکھانے کے علاوہ بچوں اور خصوصاً لڑکیوں کے لئے قرآن کلاسز کا اہتمام کرتے۔ دارالکفر میں اذان کی آواز تو سننے کو نہ ملتی لیکن نمازوں کے اوقات میں اسلامک سنٹر سے ہی موسم کے مطابق معلوم کر لیتی وہاں کی عریانی بے حیائی سے دل دکھتا تو بہت نذیرا جواب اپنے ملک میں بھی اپنی مسلمان نوجوان بچیوں کو دیکھ کر دکھتا ہے لیکن مجبوراً خاموش ہی رہتی مگر اپنے آپ کو اس رنگ میں کبھی نہ رنگتی بلکہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان میرا فخر ہوتا ۔ تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، حلال کھانا ڈھونڈنا بھی زیادہ مشکل نہ ہوتا کیونکہ اللہ کی بے شمار نعمتیں پھلوں سبزیوں دالوں کی شکل میں ہر جگہ مل جاتی ہیں اس کی عادت بناتی ۔مشکوک ذبیحے چھوڑ دیتی۔اگر کہیں یقینی حلال مل جائے تو اللہ کا شکر ادا کر کے ضرور کھاتی۔عید بقرعید کے تہواروں کا ان ملکوں میں پتہ نہیں چلتا وہ بھی اپنے ملک سے رابطے سے معلوم ہو جاتا۔ ویسے تو اب میڈیا اتنا ایڈوانس ہے کہ ہر جگہ ہر معلومات پہنچ جاتی ہے ۔ بقرعید پر البتہ میری کوشش ہوتی کہ پاکستان

میں ہی قربانی کرادی جائے۔اور مال زکوٰۃ سے بھی ہمارے پاکستان میں رہنے والے قریبی رشتہ دار یا ضرورت مند ہی فائدہ اٹھائیں یا اگر یوں ہمیں ایسے ضرورت مند نظر آئیں تو ان کی مدد کھلے دل سے کرتی۔اپنے خلق ہر مسلم غیر مسلم کے ساتھ بہترین رکھنے کی کوشش کرتی۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم دارلکفر میں نہیں اپنے مسلم وطن پاکستان میں ہیں جہاں ہم آزادی سے اپنی مذہبی تعلیمات کی پابندی بھی کرسکتی ہیں اور اس کی تبلیغ بھی۔ہمارے دلوں میں ایمان اگر پختہ ہے تو ملک کوئی بھی ہو معاشرہ کوئی بھی ہو،ہمیں گمراہ نہیں کرسکتا۔لیکن اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ جب ہم ایسے دارالکفر میں رہنے پر مجبور ہو جائیں جہاں ہر طرف فحاشی،عریانی اور بے حیائی کے مناظر دیکھنے کو ملیں تو یقیناً ہم ان کو اتنا برا نہ سمجھیں گے جتنا ہم ان سے دور رہ کر سمجھتے ہیں،اسی لئے اگر اپنے دین پر قائم رہنا ہمارے لئے دارالکفر میں ناممکن ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہم مرتے دم تک دین اسلام پر قائم رہیں اور اپنے رسولؐ کی سنت ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے آج کل جو ہمارے ملک کے حالات ہو گئے ہیں خدا نہ کرے کہ ہم اپنے ہی ملک میں بے اماں ہو کر رہ جائیں کہ ہمارے دینی شعار پردہ،داڑھی ہمارے لئے بہت بڑا الزام نہ بن کر رہ جائے۔

میری ماں جی

(سعیدہ عمران)

ہر شخص کے لئے اس کی ماں کی گود اولین پناہ گاہ ہوتی ہے جس میں چھپ کر وہ اس دنیا کے رنج والم اور سب تکالیف بھول جاتا ہے۔بچے کے لئے کائنات میں ماں کی گود جنت کے حسین ترین تحفوں میں سے ایک ایسا تحفہ ہے کہ جس کی مثال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی محبت سے دی ہے کہ میں انسان سے اس کی ماں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہوں۔میری ماں جی اس بھری دنیا میں میرے لئے محبت وشفقت ورہنمائی کا ایسا دریا تھی جس کا پانی شہد سے میٹھا تھا۔میری زندگی کی کوئی بھی ایسی مشکل ہو جسے میں حل نہ کر پا رہی ہوں اس میں اس طرح رہنمائی کرتی کہ وہ مشکل میرے لئے آسانی میں بدل جاتی۔مگر وہ کہتے ہیں کہ اچھے انسانوں کو اس دنیا سے جلد واپس بلا وا آجاتا ہے کہ ان کی وہاں بھی ضرورت ہوتی ہے۔

میری ماں بھی عرصہ آٹھ ماہ سے فالج کے مرض میں مبتلا تھیں۔پہلا اٹیک ہلکا سا تھا۔ان دنوں میرے میاں کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ پولیس کے محکمہ میں ہیں۔ان کی ٹانگ فریکچر ہوگئی جسکا بعدازاں آپریشن کر دیا گیا پہلا فالج کا اٹیک ہونے کے باوجود میری ماں جی میرے پاس آئیں تسلی دی کہ آزمائشیں انسانوں کے لئے ہی ہوتی ہیں۔

اسی دوران میں ایک بیٹی سے نوازی گئی۔ماں جی اس وقت میرے پاس ہی رہیں اور بہت خوش تھیں مجھے ان کی طبیعت کی خرابی کا قطعاً علم نہ تھا۔جب میری بیٹی 3 ماہ کی ہوئی تو ان پر سیریس اٹیک یکے بعد دیگرے ہوئے اور فالج کے باعث آدھا جسم مفلوج ہو گیا بعدازاں دماغ پر حملہ ہوا مگر میری بہادر ماں نے صبر سے برداشت کیا بہت دعائیں کیں اور مسجدوں سے کروائیں مگر مسلسل آٹھ ماہ ماں جی بستر تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ہم ماشاءاللہ نو بہن بھائی ہیں۔سب ہی شادی

شدہ ہیں۔بہنیں ایک کے بعد دوسری مسلسل ماں جی کو سنبھالتی آ ئیں ۔ بھائیوں نے بھی علاج میں کمی نہ آنے دی بہت خواہش تھی کہ ماں جی ایک بار اپنے قدموں پر کھڑی ہوسکیں مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔وہ کسی نہ کسی اسمِ الٰہی کا ورد رکھتیں اور قلب کے سکون کی دعائیں مانگتیں۔

19 اکتوبر 2009ء بروز سوموار بعداز نماز مغرب ان کا انتقال ہوا اس وقت میں لاہور سے امی جان کے پاس آئی ہوئی تھی ۔ باقی سب نزدیک ہی تھے مگر خدا کا کرنا دیکھئے کو جو نزدیک تھے وہ ماں جی سے اس وقت دور ہو گئے ہیں اور جو دور تھی وہ ان کے پاس تھی ۔آخری وقت میں ماں جی کے پاس بڑی بھابی اور میں تھے یا بڑے بھائی جی۔

ان کو علم ہوگیا کہ نزع کا عالم ہے اس لئے بار بار ماں جی سے کلمہ پڑھنے کو کہتے اور ماں جی جو کہ دو دن سے بول نہیں پا رہی تھیں بلند آواز سے کلمہ طیب پڑھتیں ۔عصر کے وقت مجھے کہنے لگیں تم پریشان نہ ہو، نماز پڑھو اور میرے لئے دعا کرو۔ میں نے نماز ادا کرنے سے پہلے نماز حاجت پڑھی اور انکے لئے بہت دعا کی ۔مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو نماز ادا کی اور ماں جی کو اپنی گود میں سہارا دے کر لٹایا۔

ماں جی نے اس وقت بڑے بھیا سے کہہ کر چھوٹے بھیا کو بلوایا تھا۔امی جان میری گود میں لیٹی ہوئی تھیں ۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں ۔مجھ سے ماں کی اتنی بے بسی دیکھی نہیں جا رہی تھی میں ان کو زم زم پلائے جاتی اور امی جان چھوٹے بھیا اور میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔

"مجھے بھی وہ تکلیف ہے (ہارٹ اٹیک) جو حاجی صاحب (ابوجان) اور پھپھو (دادی بجی) کو ہوئی تھی' ایک دم سے منہ قبلہ رخ کر کے کلمہ پڑھنے لگیں اور سختی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔میں رونے لگی۔ بھائی کہنے لگے کہ نہیں ماں جی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی اچھی موت دی ہے، انہوں نے کلمہ کا ورد اتنا زیادہ کیا اب ان کی مغفرت کی دعا کرو۔ایک وقت تھا کہ میری ماں جی کہا کرتی تھیں کہ دنیا میں کوئی چہرہ ان کی آنکھوں کو نہیں دِکھتا جو انکے باپ جیسا ہو۔امی جان کی وفات کے بعد یہی بات میں اپنے شوہر سے کہا کرتی تھی کہ دنیا بھری ہے لوگوں سے مگر کوئی چہرہ میری ماں جیسا نہیں۔

اللہ تعالیٰ زخم بھرنے والے ہیں اس بات پر کامل یقین اس وقت آیا جب امی جان کی پہلی برسی 19 اکتوبر 2010ء کو تھی اور 20 اکتوبر 2010ء کو اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹے کی نعمت سے نوازا جس کی شکل ہو بہو میری ماں جی سے ملتی ہے۔سب حیران تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے صبر کا کیسا حسین تحفہ اس کو دیا ۔اس کو دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوتی ہوں اور پروردگار کا لاکھوں بار شکر ادا کرتی ہوں ۔اسی لئے اپنے بیٹے کا نام محمد یوسف رکھا کہ یہ اس دنیا میں اللہ جی کا میرے لئے حسین ترین تحفہ ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ ہم اپنے والدین سے جنت میں ضرور ملیں گے۔ اللہ ہم سب کو نیکی اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے رکھے۔آمین

ماں

یہ سلگتا ، سسکتا ، یہ مغموم سا
اک مہینہ ہے تیری جدائی کا ، ماں!

یہ پھر آیا ہے باندھے ہوئے اک وہ درد
جس میں پنہاں ہوا غم جدائی کا ماں!
دل میں آہ اور اشکوں کا ریلہ سا جو
ہر گھڑی یہ ہے بے تاب بہنے کو ماں!
جسم میں روح میں اک تھکاوٹ سی ہے
ہجر کی سختیوں سے جھگڑنے کی، ماں!
تھا تیرے نرم ہاتھوں کا میٹھاوہ لمس
کھو گیا جب کہیں نہ ملا پھر وہ ، ماں!
وہ تیری مامتا کی تھی چھاؤں گھنی
جب ہے اتری تو یہ تن جھلستا ہے ماں!
کیسے بے چین دل کو میں قائل کروں ؟
یہ ہے ناداں سمجھتا نہیں کچھ بھی ماں!

آمنہ سطوت کلیم۔ بہاولپور

☆☆☆